تخلیقِ پاکستان

(تاریخی و سماجی مباحث)

حمزہ علوی



ترجمہ: ڈاکٹر ریاض احمد شیخ

تخلیقِ پاکستان

(تاریخی و سماجی مباحث)

حمزہ علوی

ترجمہ: ریاض احمد شیخ

تاریخ پبلیکیشنز

بک سٹریٹ 68- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان

e-mail: tarikhh.publishers@gmail.com

نام کتاب : تخلیق پاکستان (تاریخی و سماجی مباحث)
مصنف : حمزہ علوی
ترجمہ : ریاض احمد شیخ
اہتمام : ظہور احمد خاں
پبلشرز : **تاریخ پبلیکیشنز**
نک سٹریٹ 68-مزنگ روڈ لاہور، پاکستان
کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق : ریاض ظہور
اشاعت : 2014ء

تقسیم کار:
فکشن ہاؤس: نک سٹریٹ 68-مزنگ روڈ لاہور، فون: 37249218 ,042-36307550-1
فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدرآباد، فون: 022-2780608
فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 021-32603056

فکشن ہاؤس
● لاہور ● حیدرآباد ● کراچی
e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

فہرست

تعارف

حمزہ علوی پاکستان کے ان دانشوروں میں سے ہیں کہ جنہوں نے پاکستان کی تاریخ، سیاست، اور کلچر پر بڑی گہرائی کے ساتھ لکھا ہے۔ ان کی تحریروں کی مدد سے پاکستان کی بنیاد اور اس کے مسائل کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں ریاض احمد شیخ نے جن مضامین کا ترجمہ کیا ہے۔ ان میں سے کچھ کا تعلق پاکستان سے ہے اور دوسرے مضامین ان اہم موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں کہ جن کی مدد سے برصغیر ہندوستان کی تاریخ، ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ کو سمجھا جاسکتا ہے اس سلسلہ میں انہوں نے اس کا طبقاتی نقطہء نظر سے جائزہ لیا ہے۔ خاص طور سے اتر پردیش کے مسلمان متوسط طبقہ، جس کے لئے انہوں نے (Salarial) یا تنخواہ دار کی اصطلاح استعمال کی، انہیں آزادی کے بعد ہندوستان میں اپنا مستقبل نظر نہیں آرہا تھا، اس لئے وہ ایک نئے ملک میں اپنے خوابوں کی تکمیل دیکھ رہے تھے۔ دوسری جانب پنجاب اور سندھ کے جاگیردار نئے ملک میں اپنی جائیدادوں اور مراعات کا تحفظ چاہتے تھے۔ ان کے اس نقطہء نظر سے برصغیر کی تقسیم کو بہتر طریقہ سے سمجھا جاسکتا ہے اور یہ بھی کہ اس طبقاتی مفادات کا اثر پاکستان پر کیا ہوا؟ اس کی سیاست کس رخ پر چلی؟ اور کیوں عوام کو سیاست سے دور رکھا گیا؟

پاکستان اور امریکہ کے تعلقات کے سلسلہ میں حمزہ علوی کا کہنا ہے کہ ابتداء میں

امریکہ کو پاکستان سے دلچسپی نہیں تھی، اس کی دلچسپی اس وقت ہوئی ہے کہ جب ایران میں مصدق نے حکومت پر قبضہ کر کے تیل کو قومیا لیا۔ اس کے بعد سے امریکہ کو پاکستان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بعد میں آنے والے حالات نے امریکی سامراج کو وسعت دی، جنوب ایشیا، افغانستان اور وسط ایشیا کی وجہ سے اس کی اہمیت بڑھتی گئی۔

پاکستان پر ان کے دوسرے مضامین فکر کی گہرائی رکھتے ہیں۔

زندگی کے آخری سالوں میں ان کی دلچسپی خلافت تحریک سے ہوگئی تھی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے عثمانی دور کی دستاویزات کا مطالعہ کیا، اور اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی کہ آخر ترکی نے کیوں پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کا ساتھ دیا؟ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگرچہ ترکی اور برطانیہ کے پرانے تعلقات تھے، مگر جرمنی کی طرف جانے اور اس کی حمایت میں انور پاشا کی ذاتی دلچسپی تھی، کہ جس نے ترکی کو اس کا حلیف بنایا۔ انور پاشا پان ترک ازم کا حامی تھا، جب کہ مصطفٰے کمال پاشا قوم پرست تھا، جنگ کے بعد انور پاشا وسط ایشیا میں سرگرم ہوا، جب کہ مصطفٰے کمال نے جدید ترکی کی بنیاد ڈالی ___ افسوس کہ وہ اس کام کو پورا نہیں کر سکے، اور ان کا جمع شدہ مواد نوٹس کی شکل میں باقی رہ گیا۔

حمزہ علوی کے مضامین کا ترجمہ کرنا مشکل کام ہے، خوشی ہے کہ ریاض احمد شیخ نے اس کام کو بخوبی ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

جولائی 2012ء

لاہور

تقسیم کے نشانات کی غلط تفہیم

Misreading Partition Road Signs

اب اس مرحلے پر اس بحث کا کوئی حاصل نہیں کہ تقسیم کے عمل کو روکا جا سکتا تھا۔ اب اس سوال کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ پاکستان اور ہندوستان کی مشترکہ تاریخ کو مختلف زاویوں (Perception) سے بیان کرنے کے باعث دونوں قوموں کے درمیان تعصبات اور نفرتوں کی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ جس کے باعث معاملات مزید الجھاؤ کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس مضمون میں جو عرض کیا جا رہا ہے وہ ایک عمرانیات اور سماجی بشریات (Anthropologist) کی کچھ گزارشات ہیں، جس کا مقصد کچھ معاملات کو اُجاگر کرنا ہے تاکہ ہم ان کا دوبارہ جائزہ لے سکیں۔ اسے کسی بھی صورت میں متبادل تاریخ نہیں سمجھنا چاہیے۔

یہ بات بڑے افسوس کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انڈیا اور پاکستان کے درمیان خوشگوار تعلقات کی بحالی میں کئی معاملات حائل ہیں۔ ہمیں قوی امید ہے کہ انڈیا اور پاکستان کے لوگ ان تمام مسائل کو حل کرنے کے لئے کوئی راہ نکالنے میں ضرور کامیاب ہو سکیں گے تاکہ مستقبل میں دوستی کا ایک نیا اور دیرپا باب کھول سکیں۔

اس تحریک کی بنیادیں جو بالآخر تخلیق پاکستان پر اختتام پذیر ہوئی۔ اس کی بنیادیں شمالی ہندوستان کے ان مسلمان اشرافیہ (بالائی طبقوں) کے انیسویں صدی کے بحران میں تلاش کی جانی چاہیے جن کے آباؤ اجداد وسطی ایشیا، عرب اور ایران سے ہجرت کر کے آئے تھے (۱)۔ اس بحران کے پس پشت ایک اہم وجہ نوآبادیاتی سرکار کا وہ فیصلہ تھا جس کے تحت فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت سے خاتمہ تھا جو کہ اشرافیہ کی زبان تھی۔ اس فیصلے کے نتیجے میں اشرافیہ کے دو مختلف گروہ

متاثر ہوئے جن میں سے پہلا طبقہ ریاست کے ان اہلکاروں پر مشتمل تھا جنھیں اب اپنے کام کاج اور ملازمتوں کے حصول کے لئے انگریزی زبان کو سیکھنا تھا۔ ہم اسے تنخواہ دار طبقہ کہیں گے۔ ایک ایسا معاشرہ جو کہ اب تک صنعت کاری کے عمل میں داخل نہ ہو سکا ہو اور جہاں نجی شعبوں میں ملازمت کے مواقع ناپید ہوں۔ ایسے معاشرے میں صرف ریاست ہی سب سے بڑی آجر بن جاتی ہے جو کہ اس طبقے کی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔

تنخواہ دار طبقہ نئے انگریزی تعلیم یافتہ پیشہ وروں (Professionals) کے ساتھ منسلک تھا خاص طور پر اس مرحلے پر جب ریاست زبان کی نئی پالیسی کے ساتھ ساتھ ایک نئے قانونی (law) نظام کے ڈھانچے کو بھی متعارف کرنے جا رہی تھی۔ تنخواہ دار اور نئے پیشہ ورانہ گروہ (قانون، طب اور دیگر شعبوں سے منسلک افراد) اس مشترکہ نظامِ تعلیم اور نئے ابھرتے ہوئے اینگلو دیسی (Anglo Vernacular) ثقافت کا مشترکہ حصہ بن رہے تھے۔ انہوں نے نسجا ایک نئے مشترکہ سماجی نظام کو تشکیل دیا۔ گرامچی کے الفاظ میں یہ ایک ایسا منسلک (auxiliary) طبقہ (class) تھا جو کہ تعداد میں تو بڑا نہ تھا لیکن پر اثر (articulate) ضرور تھا۔ یہ نئے دانشور (intellectual) ڈھانچے کا مرکزی کردار تھے۔ اس گروپ کے اراکین، عام طور پر نہ سہی لیکن عموماً بڑے جاگیرداروں یا خوشحال کسانوں کے بیٹے تھے (بسا اوقات بیٹیاں بھی) جو کہ اس بات کے متحمل تھے کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں جس کی انھیں ضرورت اور خواہش تھی۔ اس صورتحال نے تنخواہ دار طبقے، نئے پیشہ ورانہ اور دیگر طبقات کے درمیان بڑا قریبی تعلق پیدا کر دیا۔

انیسویں صدی کا مسلمان تنخواہ دار طبقہ جو کہ انگریزی کے بجائے فارسی پڑھ کر آگے آیا تھا اس نئی تبدیلی کی وجہ سے پس پشت پڑتا گیا اور ان کی چھوڑی ہوئی اس جگہ کو کئی ہندو ذات کے افراد نے جنھوں نے کہ انگریزی زبان کو اپنا لیا تھا، پر کرنا شروع کر دیا۔ جس سے مقابلے کے ایک رجحان نے جنم لیا۔ دشمنی کا یہ رویہ تمام مسلمانوں اور ہندوؤں میں نہ تھا بلکہ صرف مسلمان اور ہندو تنخواہ دار طبقہ، مسلمان اشرافیہ بالمقابل ہندو خدمتگار ذاتوں (Hindu Service Castes) مثلاً کھتریوں، کائستھ (Kayastha)، شمالی ہندوستان میں کشمیری برہمن اور بنگال کے برہمن اور Baidyas کے درمیان تھا۔ اس صورتحال کی وجہ سے مسلمان اشرافیہ نے اپنے مفادات کے تحفظات کے لئے مسلمانوں کے لئے الگ کوٹہ کے مختص کئے جانے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اس

مقصد کے لئے انھوں نے معاشرے کے بڑے گروہ متحرک کر کے ان کی حمایت حاصل کر لی اور بالخصوص زمینداروں اور خوشحال کسانوں سے اپنے نامیاتی (Organic) تعلق کی وجہ سے اس سارے جھگڑے میں مذہبی نظریہ بندی کا کوئی کردار نہ تھا اور نہ ہی معاشرے کے مسلمان اور غیر مسلم گروہوں معاشروں کے باقی ماندہ افراد کا تنخواہ دار طبقے کی اس سیاست سے معاشرے کے دیگر افراد کا کوئی مفاد وابستہ نہ تھا۔ کانگریس جو کہ عمومی طور پر ہندوستانی تنخواہ دار طبقے (اور خصوصاً ہندو خدمتگار طبقوں) کی نمائندہ بن کر ابھری تھی، وہ اپنے مطالبات میں ملازمت کے اس نظام کو مزید ہندوستانی رنگ دینے کے حق میں تھی۔ کیونکہ اب تک برطانوی ہندوستان کی نوکر شاہی کی تمام ملازمتیں برطانوی نژاد افراد کے لئے مختص تھیں۔

مسلمان اشرافیہ کا دوسرا گروہ ان علماء اور مذہبی اسکالرز پر مشتمل تھا جو کہ عربی اور فارسی زبان پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ شرعی قوانین پر بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کا پس منظر بھی کم وبیش مسلمان تنخواہ دار طبقے اور نئے پیشہ ورانہ طبقے سے بڑی حد تک مماثلت رکھتا۔ لیکن ان کے مفادات میں بڑے تضادات تھے خاص طور پر ان گروہوں کے انگریزی زبان اور سائنسی ثقافت کی طرف پائے جانے والے رجحانات کے باعث۔ اس سے قبل مسلمان تنخواہ دار طبقے عربی اور فارسی کی تعلیم کے لئے درسگاہوں (مدرسوں) کا رخ کرتے تھے۔ لیکن انگریزی زبان کے متعارف ہونے کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ قبل ازیں جید علماء کو فتوے جاری کرنے اور متحرک مسلمان گروہوں کے درمیان تضادی امور میں مصلحت سازی (mediate) کرنے کا اختیار بھی حاصل ہوتا تھا۔ انگریزوں کے متعارف کردہ نئے قانونی نظام کے باعث علماء کو اپنے اس کردار سے بھی محروم ہونا پڑا۔ اس صورتحال کے باعث علماء کا انگریزوں کے خلاف شدت سے مخالف ہو کر سامنے آنا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ علماء نے نہ صرف شدت سے انگریزی زبان، اور حکمرانوں کی ثقافت کی مخالفت کی بلکہ انگریزی حکومت کے بھی کلی طور پر مخالف ہو گئے۔ انھوں نے ساتھ ہی بڑی شدت سے پیشہ وروں، تنخواہ داروں اور ان مسلمان معلموں (Educationalists) کی بھی مخالفت شروع کر دی جنہوں نے انگریزی زبان اور مغربی ثقافت کو اپنانا شروع کر دیا تھا۔ علماء اور مولوی حضرات ابتداء میں بڑے شدت پسند تھے۔ لیکن ان کو پسپائی اس وقت اٹھانا پڑی جب ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت کے اختتام پر انہیں ناکامی کے بعد مدرسوں تک محدود ہونا پڑا۔ کافی عرصے بعد گاندھی کی زیر قیادت ۱۹۱۸ء میں شروع

ہونے والی خلافت تحریک کے نتیجے میں مذہبی انتہا پسندوں (idiom) کو انڈیا کی مسلمان سیاست میں دوبارہ اپنا کردارادا کرنے کا موقع ہاتھ لگ گیا۔

مسلمان اشرافیہ کا ایک تیسرا گروہ بھی تھا جو کہ زمینداروں پر مشتمل تھا جو کہ اس زبان کی تبدیلی کی پالیسی سے براہ راست متاثر نہ ہوا تھا۔ مسلمان اور ہندو زمینداروں نے انگریز حکومت کی مدد کر کے انگریزوں کی آشیر باد حاصل کر لی تھی۔ کچھ زمینداروں نے انفرادی سطح پر کانگریس اور مسلم لیگ میں شمولیت بھی اختیار کر لی تھی لیکن ان کے اس اقدام کے پس پشت ان کے وہ گلے اور شکوے تھے جو کہ انہیں تنخواہ دار اور نئے پیشہ وروں سے لاحق تھے۔

مسلمان تنخواہ دار اور پیشہ ور ان غریب مسلمانوں جو کہ شہری دستکاروں (artisans) خصوصاً جولاہوں کے پیشوں سے وابستہ تھے۔ ان کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مسلمان علماء بھی ان غریب مسلمانوں تک رسائی نہیں رکھتے تھے۔ ان کے مسائل سمجھنے اور حل کرنے کے بجائے انہوں نے مذہبی جنونیت کو ہوا دینا شروع کر دی۔ یوپی کے کچھ مسلمان وکلاء نے جو کہ جولاہا پس منظر سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے ''مومن انصار پارٹی'' اور ''آل انڈیا مومن کانفرنس'' بنا ڈالی لیکن ان کا قومی سیاست پر کوئی خاص اثر نہ پڑا۔

سر سید احمد خان نے ہندوستانی مسلمانوں میں انگریزی زبان اور سائنسی فکر کی بنیاد ڈالی۔ مسلمان اصلاح پسندوں (reformers) نے ان کے کام کو بعد ازاں آگے بڑھایا۔ مسلمانوں کی تعلیمی ایسوسی ایشن کی شاخیں بیشتر جگہوں پر قائم کی گئیں۔ علماء کو جو کہ انگریز سرکار کی تبدیلی زبان کی پالیسی سے بڑی بری طرح متاثر ہوئے وہ اب سر سید کی تحریک کے بھی مخالف ہو گئے۔ علماء نے عام مسلمانوں کو سر سید سے بہکانے کے لئے ان کے خلاف طرح طرح کے پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دئے۔ سر سید کے کردار کو انڈین نیشنلسٹ تاریخ میں ان کی کانگریس مخالفت پالیسی کے باعث بڑے غلط انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس بات کی شدت سے ضرورت ہے کہ ان کے کردار کا معروضی بنیادوں (objectively) پر دوبارہ جائزہ لیا جائے۔

کئی محققوں نے بینکم چندرا چترجی (Bankim Chandra Chatterje) کو ہندوستانی قوم پرستی کے بانیوں سے تعبیر کیا ہے (۴)۔ مسلمانوں کے شدید تحفظات کے باوجود کانگریس نے چترجی کے لکھے ہوئے بندے ماترم کو کانگریس کا ترانہ قرار دے دیا۔ یہ بہت مفید

(instructive) ہوگا کہ ہم ان کے خیالات کا سرسید کے خیالات سے تقابل کریں۔ بینکم کے مسلمان دشمنی کے نظریات کو ایک طرف رکھتے ہوئے ہمیں یہ بات یاد رکھنا ہوگی کہ اس نے کہا تھا کہ انگریز ہمارے دشمن نہیں ہیں اس لئے ہمیں ان سے لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بجائے اس نے اس بات پر زور دیا کہ انگریزوں کے پاس جدید علم ہے۔ اگر ہمیں ترقی کرنا ہے تو پھر ہمیں یہ علم ضرور حاصل کرنا چاہئے۔ بینکم (۹۴_۱۸۳۸) دراصل اس بات کو آگے بڑھا رہا تھا جو کہ قبل ازیں سرسید احمد (۱۸۹۸_۱۸۱۷) کہتے چلے آئے تھے۔

بینکم کا کلاسیکی کھیل اور ناول آنند ماتھ (Anandamath) دراصل ان کے نظریات کو عیاں کرتا ہے۔ ٹی ڈبلیو کلارک (T.W.Clark) نے بینکم کے اس کھیل کو ہی اس کے سب سے اہم بیان (statement) سے تعبیر کیا اور اس کے اختتامی باب کا ترجمہ بھی کیا (۵)۔ اس کھیل کا ہیرو ستیانندہ (Satyananda) ایک لڑائی میں تمام مقابل مسلمان افسران کو ہلاک کر دیتا ہے (جبکہ مسلمان سپاہی فرار کا راستہ اپناتے ہیں)۔ جبکہ انگریز زندہ بچ جاتے ہیں۔ اس مرحلے پر ستیانندہ کا حاکم (He) (جو کہ بینکم خود تھا) اس کو حکم دیتا ہے کہ اب مزید قتل بند کر دے چونکہ اب زندہ بچ جانے والے صرف انگریز ہیں۔ ستیانندہ یہ حکم سن کر الجھن (puzzled) کا شکار ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ تم نے مجھے اب مزید قتل کرنے سے کیوں روک دیا؟ اس کے جواب میں حاکم اس کو کہتا ہے کہ تم نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے۔ مسلمانوں کی حکمرانی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اب تمہارے لئے کرنے کا کوئی کام نہیں بچا۔ اس کے جواب میں ستیاندا کہتا ہے کہ مسلمانوں کی حکمرانی تو ختم ہو گئی ہے لیکن ہندوؤں کی حکمرانی تو اب قائم نہیں ہوئی اور برطانیہ اب بھی کلکتہ پر قابض ہے۔ اس کے جواب میں حاکم (He) کہتا ہے "ہندو اقتدار ابھی قائم نہیں ہوگا" اس کے جواب میں ستیانندہ پوچھتا ہے کے "میرے مالک اگر ہندو اقتدار ابھی قائم نہیں ہوگا تو پھر یہ کب ہوگا"۔ اس کے جواب میں حاکم (He) کہتا ہے کہ "برطانیہ حکمرانی کرلے گا، ہماری زمین سے فزیکل (Physical) علم غائب ہو گیا ہے۔ ہم کو اسے برطانیہ سے سیکھنا چاہئے۔ انگریز علم کے معاملے میں ذہین ہیں۔ یہ اچھے استاد بھی ہیں۔ اس لئے ہمیں انگریزوں کی حکمرانی قائم کرنی چاہئے۔ تمہارا وعدہ وفا ہو چکا۔ تم اپنی دھرتی ماں کے لئے خوش بختی لا چکے ہو۔ تم نے یہاں برطانوی حکومت قائم کر دی ہے۔ اب انگریز ہمارے دشمن نہیں ہیں۔ انگریز اب ہمارے دوست اور حکمران

ہیں۔اب کوئی انہیں جنگ میں شکست نہیں دے سکتا"۔

بینکم انگریزی تعلیم کی حمایت کر رہا تھا اور برطانوی حکومت کو تسلیم کر رہا تھا بالکل اسی طرح جس طرح قبل ازیں سرسید احمد یہ کام کر چکے تھے۔بینکم کو یہ بات کہنے پر قابل ستائش گردانا جاتا ہے جبکہ سرسید کو یہی بات کہنے پر بڑا برا بھلا کہا جاتا تھا۔یہ غیر معمولی تضاد ہندوستانی قوم پرستوں کے اندرونی تعصبات کو اُجاگر کرتا ہے۔یقیناً سرسید احمد اور بینکم کے درمیان ایک لحاظ سے فرق موجود ہے۔بینکم کے ستائشی ٹی بی کلارک لکھتے ہیں" بینکم کے مسلمانوں کی طرف حوالے عمومی طور پر غیر دوستانہ بلکہ کئی جگہوں پر تو دشمنانہ (hostile) ہیں"۔ یہ سرسید کے اس رویئے کے بالکل برعکس ہے جو کہ وہ دیگر مذہبی گروہوں کے متعلق رکھتے تھے۔

اپنے ایک مضمون " مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تعلق" میں سرسید لکھتے ہیں:
"صدیاں گزر گئی ہیں دونوں کو ایک ہی سرزمیں پر رہتے ہوئے اور ایک ہی زمین کا اناج کھاتے ہوئے،ان ہی دریاؤں کا پانی پیتے ہوئے،ایک ہی ملک کی مشترکہ ہواؤں میں سانس لے کر بھی مسلمان اور ہندو دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں رہے۔جیسا کہ میں پہلے بھی کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں،ہندوستان ایک خوبصورت دلہن ہے اور ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں اس کی خوبصورتی کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی دونوں آنکھوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے یہ مکمل اور برابری کی بنیاد پر سلامت رہیں"۔ یہ دراصل ان کا ہندو مسلم اتحاد کے لئے بلاوا (call) تھا (٦)۔ہمیں ان کی تحریروں میں ہندوؤں کے خلاف کوئی نفرت نہیں ملتی۔ وہ اپنی سماجی زندگی میں فرقہ وارانہ (communal) تعصبات سے بالاتر تھے۔ان کے کئی قریبی دوست ہندو تھے۔انہوں نے اپنے چار سالہ پوتے کی بسم اللہ جیسی خالصتاً مذہبی تقریب کے موقع پر اپنے پوتے کو اپنے سب سے دیرینہ دوست راجہ جیکشن داس کی گود میں بٹھایا۔یہ علامتی عمل ان کے لبرل مذہبی خیالات کی جھلک تھا۔ان کا کانگریس کے مسئلے پر اختلاف کرنا ایک بالکل الگ معاملہ ہے۔سرسید احمد نے جمہوریت کی مخالفت عمرانی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کی۔ان کا کہنا تھا کہ انگریزی معاشرہ آزادانہ عمل (free-acting) پر مشتمل انفرادی افراد کا ایک معاشرہ ہے جنھیں ہندوستان کی گروہی (community) وفاداریوں کے بارے میں اتنا علم نہیں۔ہندوستان کے بالخصوص سیاسی ماحول میں لوگ آزاد اور انفرادی حیثیت میں اپنا کردار ادا نہیں کرتے اور نہ ہی کر سکتے ہیں بلکہ معاشرتی

ضروریات کے تحت انہیں اپنی کمیونٹی کے افراد کو ہی پشت پناہی (süppoprt) فراہم کرنا پڑتی ہے۔ایک مسلمان ووٹر کو ایک مسلمان امیدوار ہی کو ووٹ کرنا ہوگا جبکہ ایک ہندو صرف ہندو کو ہی ووٹ کرے گا۔ سرسید کے خیال میں یہی ہندوستانی ثقافت کی حقیقت تھی۔اس لئے جب تک معاشرہ اور ثقافت انفرادی سطح پر کام کرنا شروع نہ کرے اس وقت تک ہندوستان کے لئے جمہوریت سودمند نہیں ہوسکتی۔انفرادیت کا عمل وقت کے ساتھ ہونا شروع ہوجائے گا۔ہندوستان کے اس ثقافتی ماحول میں مسلمان پر ہندؤوں کی اعدادی اکثریت مستقل بنیادوں پر قائم ہوجائے گی۔وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کچھ عرصے کے لئے برطانیہ کا بحیثیت ایک غیر جانبدار ریفری کے طور پر ہندوستان میں رہنا ٹھیک ہوگا۔ سرسید کے برطانیہ کے غیر جانبدار کردار کی ادائیگی پر ایمان کو یقیناً تنقید کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔لیکن ان کا خیال تھا کہ اس کا فی الحال کوئی نعم البدل نہیں۔

اپنے بعد آنے والے دیگر انڈین قوم پرستوں کے برعکس سرسید کو نوآبادیاتی (کلونیل) نظام کے استحصال اور تباہ کن اقدامات کے متعلق کوئی خاص اندازہ نہ تھا۔لیکن پھر بھی انہیں برطانوی نوکر شاہی کے نسل پرستانہ، کٹھور اور متکبر ہونے کا بخوبی اندازہ تھا۔طبقہ اشرافیہ سے تعلق کے باعث ان کا اپنا اس بات پر یقین تھا کہ طبقۂ امراء میں پیدائش اور پرورش انسانی تربیت اور رویوں میں بڑی بنیادی تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ایک موقع پر انہوں نے کہا" برطانیہ یہاں سے بہت دور ہے اس لئے اس بات کی تصدیق کرنا بہت مشکل ہے کہ چند خودسر اور متکبر بیوروکریٹ کہیں کسی نائی کے بیٹے تو نہیں"۔ان کے جریدے تہذیب الاخلاق کے کئی شمارے برطانوی نوکرشاہی کے اس متکبر رویے پر تنقید کرتے نظر آتے ہیں جو کہ انہوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔مولانا محمد علی نے ۱۹۲۳ کی کوکنڈ کانگریس (Cocanda Congress) میں اپنے صدارتی خطبے میں سرسید کے لئے بھرپور تعریفی کلمات استعمال کرتے ہوئے انھیں ایک باوقار انسان قرار دیا۔سرسید پر برطانیہ کی طرف جھکاؤ رکھنے کے الزامات کا جواب دیتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ سرسید کا کردار کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ (سرسید) اس بات سے بہت دور تھے جبکہ ان کے سیاسی مخالفین انہیں چاپلوس قرار دیتے تھے"۔

سرسید احمد تنقید سے بالاتر نہیں ہیں۔انہوں نے کئی مواقعوں پر بنگال کے ان کانگریسی bhadralok سیاستدانوں پر حملے کئے جنہوں نے انھیں " بابو" کہہ کر طعنے دیئے۔لیکن

درحقیقت یہ باتیں جیسے کو تیسا (Tit for Tat) سے زیادہ نہ تھیں۔ لیکن اس سے زیادہ سنجیدہ معاملہ ان کا خواتین کی تعلیم کے متعلق خیالات تھے۔ لیکن یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ وہ شخص جس نے کئی انتہائی دقیانوسی اور قدامت پسند معاملات پر بڑا جرأت مندانہ رویہ اپنایا وہ اس معاملے (خواتین کی تعلیم) میں کوئی اچھی کارکردگی نہ دکھا سکے۔ ان کے اس معاملے پر خیالات آج بھی کسی صورت قابل قبول نہیں۔ آخر میں سب سے اہم اور سب سے بدترین بات ان کا غریب اور غیر اشراف (اجلال) کی طرف حقارت کا رویہ تھا۔ وائسرائے ہند کی قانون ساز کونسل کی تشکیل کی طرف واضح اشارہ کرتے ہوئے جو کہ یقیناً ان کے اپنے اشرافیہ طبقے (ذات) کے تعصبات کی بنیاد تھا انہوں نے کہا "یہ بہت ضروری ہے کہ کونسل کے اراکین کا تعلق معاشرے کے بلند سماجی طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد پر مشتمل ہونا چاہئے۔ کیا ہماری اشرافیہ اس بات کی اجازت دے گی کہ درجۂ ذیلی اور غیر معروف سماجی پس منظر سے تعلق رکھنے والے افراد کو چاہے انہوں نے ایم۔اے یا بی۔اے کی سند ہی کیوں نہ حاصل کر رکھی ہو انہیں اپنے سر پر بٹھانے کی اجازت دے گی اور کیا انہیں یہ اختیار بھی مرحمت کر دیں کہ وہ ان کی زندگیوں اور جائیداد کے متعلق قوانین بنانے کا اختیار بھی حاصل کر لیں؟"

وہ (سرسید) آخرکار وقت اور اپنے طبقے (کلاس) کی پیداوار تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سرسید کا رام موہن رائے سے بڑا دیرینہ تعلق تھا۔ رام موہن صاحب رائے خود صاحب رائے اور حقیقت پسند تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سرسید رام موہن رائے کی فارسی کی تحریروں کے باقاعدہ قاری تھے۔ ٹرول (Troll) کا کہنا ہے کہ "رام موہن رائے کی شخصیت اور اس کے کام کا سرسید پر گہرا اثر تھا۔ ان دونوں شخصیات کے خیالات میں متوازی پن اتفاق ہو سکتا ہے۔ یا پھر یہ کہ اس کے پس پشت وہ مشترکہ تاریخی پس منظر بھی ہو سکتا ہے۔ جو کہ دونوں کو ایک جیسا میسر آیا اور جن کے باعث سرسید نے رام موہن اور انکی وحدانی (Monotheistic) برموسماج کے زیر اثر آئے"۔ سرسید احمد خود اپنی اوائل عمری کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں وہ کس طرح بنگال کے اس اصلاح پسند (reformist) سے متاثر ہوئے جب وہ ۱۸۳۰ء میں ان سے مغل دربار میں ملے۔ یہ کہا جا سکتا ہے "وہ سماجی تبدیلیاں جو کہ ہندوستان میں انیسویں صدی میں نوآبادیاتی نظام کے تحت لائی گئیں اور اس کے ساتھ ساتھ نوآبادیاتی سرمایہ داری (۱۰) کے عروج کے باعث حقیقت پسندی اور

وحدانی (monotheistic) خیالات کو ہندوستانی سماج میں پھلنے پھولنے کا موقع میسر آسکا۔ یہی معاملہ رنادے (Ranade) کے پراتھنا سماج اور مہاراشٹر کے بھنڈارکر (Bhandarkar) کے ساتھ بھی تھا۔ ان قوم پرست تحریکوں نے ہندوستان کے بالائی طبقوں کے انگریزی پڑھے لکھے افراد کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

انیسویں صدی کے آخر تک نئے پڑھے لکھے مسلمان طبقے نے اپنی تشویش کا اظہار کرنا شروع دیا تھا۔ علی گڑھ میں سرسید کے غیر معروف جانشیں نواب محسن الملک نے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو مسلمان اشرافیہ کے وفد کی وائسرائے لارڈ منٹو سے ایک ملاقات شملہ میں منعقد کروائی۔ اس ملاقات میں مسلمانوں کے مطالبات کو برطانوی سرکار تک پہنچایا گیا۔ ہندوستانی قوم پرستوں نے اس ملاقات کا صرف ایک خلاصہ اخذ کیا جو کہ یہ تھا کہ برطانیہ سرکار اس ملاقات کے ذریعے مسلمانانِ ہند کو جدوجہد آزادی کی قومی تحریک سے ایک سازش کے ذریعے الگ کرنے میں کامیاب ہوگئی اور، تقسیم کرو اور حکمرانی کرو، کے اصول کے تحت برطانیہ سرکار کے لئے بڑا مفید اور کارآمد رہا۔ بدقسمتی سے ہندوستان کے قوم پرست تاریخ دان اس رویئے کے باعث مسلمانوں کی تحریک کے پس پشت دیگر محرکات کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ مولانا محمد علی (جوہر) اپنے کوکنڈا کانفرنس کے صدارتی خطبے میں شملہ وفد کی کارکردگی کو تیز وتند (rashly) الفاظ میں "قابل ستائش کارکردگی" سے تعبیر کیا۔ ان تمام خیالات کے باعث ہی یہ بات کہی گئی کہ مسلمانوں کی تحریک نوآبادیاتی حکومت کی پالیسی "تقسیم اور حکمرانی" کے اصول کا نتیجہ ہونے سے زیادہ اور کچھ نہ تھی۔ مولانا محمد علی اس طرح کی بات کھل کر تسلسل سے کہتے آئے تھے۔ جن کے لئے وہ بہت بدنام (Notorious) تھے۔ ہندوستان کے بیشتر قوم پرست تاریخ دان سوائے بیمل پرشاد کے استثناء کے دیگر تمام مولانا محمد علی (جوہر) کے ان تبصروں کو تمام ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی منصوبہ بندی سمجھ بیٹھے۔

۱۹۰۶ء کے شملہ وفد کی ملاقات کے پس منظر میں سیکریٹری آف اسٹیٹ برائے انڈیا، جان مارلے کے اس بیان نے بڑا اہم کردار ادا کیا جس میں اس بات کا اظہار کیا گیا کہ ان کی حکومت جلد ہی ہندوستان میں دستوری اصلاحات کا نظام شروع کرنے جارہی ہے۔ محسن الملک نے اطلاع ملتے ہی علی گڑھ کالج کے پرنسپل آرچبولڈ کو لکھا جو کہ اس وقت شملہ میں اپنی تعطیلات منا رہے تھے۔ محسن الملک نے اپنے اس خط میں آرچبولڈ کو لکھا کہ موقع کی اہمیت اور نزاکت کو سمجھتے ہوئے کیا یہ ان کے لئے ممکن

ہوگا کہ وہ لارڈ منٹو سے یہ معلوم کرسکیں کہ کیا وہ ہندوستانی مسلمانوں کے ایک وفد سے ملاقات کے لئے راضی ہو جائیں گے۔ یہ وفد مجوزہ آئین اور دستوری اصلاحات کے متعلق مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے وائسرائے کو آگاہ کرنے کا خواہشمند تھا۔ وائسرائے ہند اس ملاقات کے لئے رضامند ہو گئے۔ بیمل پرشاد کے مطابق (اور اس مقصد کے لئے انہوں نے کئی حوالے بھی فراہم کئے ہیں) یہ ملاقات مکمل طور پر محسن الملک کی خواہش پر ہوئی اور اس کے پس پشت کسی بھی صورت آرچبولڈ یا برطانوی حکومت کی کوئی تجویز شامل نہ تھی۔ مولانا محمد علی (جوہر) کا اس ملاقات کو "بڑی زبردستی کامیابی" قرار دینا ایک بے بنیاد اور شرارت(mischiviuos) تھی۔

محسن الملک نے شملہ سے رضامندی کا اشارہ ملتے ہی ایک یادداشت تیار کروائی اور لکھنؤ میں دیگر مسلمان زعماء سے تبادلہ خیال کیا۔ اس ملاقات میں وائسرائے اور مسلمان اکابرین کے لئے سب سے بڑی پریشانی کا باعث نئے وجود میں آئے ہوئے مشرقی بنگال اور آسام میں شروع ہونے والا مئوثر اور مستقل احتجاج تھا جو کہ تقسیم کو منسوخ کر کے دونوں صوبوں کو واپس مشترکہ بنگال کی صورت میں دیکھنے کے لئے تھا۔ ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ اور نواب علی چودھری نے لکھنؤ کے اجلاس میں اس بات پر زور دیا کہ یادداشت میں اس بات کا ضرور ذکر کیا جائے کہ بنگال کی تقسیم کو کسی صورت منسوخ نہ کیا جائے۔ لیکن علی گڑھ اس معاملے میں عدم دلچسپی رکھتا تھا اسی لئے اس یادداشت میں اس کا کوئی ذکر نہ تھا۔ اس بات پر احتجاج کرتے ہوئے ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ نے اس وفد کا حصہ بننے سے انکار کر دیا جب کہ نواب علی چودھری بخوشی اس وفد کا حصہ بنے رہے۔

وائسرائے ہند خود اس بات پر بڑے مایوس ہوئے کہ تقسیم بنگال کا معاملہ اس یادداشت کا حصہ نہ تھی۔ منٹو نے اس معاملے کو خود ہی اٹھالیا اور خود ہی جواب دیتے ہوئے مشرق بنگال اور آسام کی مسلمان کمیونٹی کو مشورہ دیا کہ وہ اس معاملے پر بھرپور جواب دیں اور برطانیہ کے نظام عدل سے منصفانہ رویئے کی امید رکھیں۔ وفد اپنے مطالبات میں جداگانہ انتخابات کا حق، وائسرائے کی کونسل اور اس کی ایگزیکٹو کونسل میں مخصوص کوٹہ کا مختص کیا جانا، اسی طرح صوبائی کونسلوں اور ہندوستانی جامعات کے سینیٹ اور سینڈیکیٹس میں مسلمانوں کے لئے کوٹہ کا مختص کیا جانا شامل تھا انھوں نے مسلمانوں کے لئے سرکاری ملازمتوں اور ججوں کی آسامیوں میں بھی مسلمانوں کے لئے کوٹہ مختص کرنے کا مطالبہ کیا۔ یہ تمام مطالبات مسلمان تنخواہ دار طبقے اور پیشہ ور

افراد کی توقعات کے عین مطابق۔ ان تمام مطالبات کے جواب میں منٹو نے کسی وعدے کے بجائے صرف ہمدردی کا اظہار کیا (۱۲)۔ یہ تھی اس "زبردست کامیابی" کی حقیقت۔

مسلمانوں کے جداگانہ مطالبے کے پس پشت امیدواران کی اس شکایت کو بڑا اہم کردار حاصل تھا جس کے تحت ان کا شکوہ تھا کہ ان کو مسلمانوں کی اکثریت والے حلقوں میں بھی اپنی کامیابی حاصل کرنا مشکل نظر آتی ہے۔ چونکہ جائیداد اور ٹیکس کی ادائیگی کی شرائط کو ووٹر سے منتھی کرنے کے باعث مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اپنے ووٹ کی ادائیگی کے حق سے محروم ہو جائے گی۔ شملہ کمیشن کی رپورٹ یہ بات عیاں کر چکی کہ ہندوستان کے وہ صوبے جو گورنر کے براہ راست زیر کنٹرول تھے ان صوبوں میں ان کڑی شرائط کے باعث کل ووٹرز کی صرف ۸ء۲ فیصد آبادی ہی ووٹ کی ادائیگی کا حق استعمال کر سکتی تھی۔ اہل ووٹرز کی یہ انتہائی کم تعداد اس کل آبادی کے اس حصے پر مشتمل تھی جو کہ صاحب جائیداد تھے۔ رپورٹ نے اس سنگین صورتحال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا "جائیداد کو ووٹ کی ادائیگی سے منسلک کرنے کے باعث آبادی کے چند گروہوں اور طبقات کو نہ صرف فوقیت حاصل ہو گئی بلکہ کئی جگہوں پر تو انہوں نے اپنی اجارہ داری ہی قائم کر لی وسطی صوبوں میں بنیا اور برہمنوں نے جائیداد کے اصول کے باعث اپنی آبادی کے صد فیصد حصے کو ووٹ کے قابل قرار دلوا دیا جبکہ دیگر طبقات اس سے بری طرح متاثر ہوئے"۔ رپورٹ نے بنگال کے کرایہ داروں (under-tenants) کے مکمل طور پر اس انتخابی عمل سے باہر ہونے کا بھی ذکر کیا۔ جداگانہ انتخابات کا مطالبہ درحقیقت ایسی ہی غیر منصفانہ نمائندگی کے عمل کو روکنے کے لئے دفاع کے طور پر استعمال کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ اصولی طور پر تو مخلوط طریقہ انتخاب کے مطالبہ مذہبی اقلیتوں کو قومی سیاست کے دھارے میں لانے کا باعث بن سکتا تھا لیکن جداگانہ انتخاب کے عمل کو ایک وقتی اور عارضی افاقے (remedy) کے طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔

ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ جو کہ شملہ وفد میں شامل نہ ہونے کے باعث سیاسی طور پر تنہائی کا شکار ہو چکے تھے انہوں نے جلد ہی ایک نیا سلسلہ شروع کیا اور دسمبر ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم پولیٹیکل ایسوسی ایشن کے قیام کا اعلان کیا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ یہ اجلاس ان ہی دنوں ہوا جبکہ مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کا بھی اجلاس جاری تھا۔ اس اجلاس میں آل انڈیا مسلم پولیٹیکل ایسوسی ایشن بنانے کا معاملہ زیر غور تھا۔ ۳۰ دسمبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی۔ نئی پارٹی پر قابض ہونے

کے متلاشی علی گڑھ، یوپی گروہ نے وقار الملک کی زیر قیادت پارٹی کے تقریباً تمام عہدوں پر قبضہ حاصل کرتے ہوئے ایک بار پھر نواب سلیم اللہ کو کنارے کر دیا۔

کانگریس اپنے ابتدائی عرصے میں کوئی خاص مختلف نہ تھی۔ اس کے مطالبات بھی زیادہ تر وہی تھے۔ مثلاً (۱) سرکاری ملازمتوں میں ہندوستانیوں کے تناسب کو بڑھانا اور ہندوستانیوں کو ملازمتوں میں ترقی دے کر مزید اعلیٰ مقام دینا۔ (۲) وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل اور دیگر مراکز حکمرانی میں ہندوستانیوں کو زیادہ سے زیادہ نمائندگی دینا۔ یہ مطالبات مسلمان تنخواہ دار اور پیشہ ور طبقات کے مفادات کے بھی عین مطابق تھے لیکن ان کا دائرہ زیادہ وسیع تھا۔ دونوں جماعتوں میں سے کوئی بھی جماعت حقیقی معنوں میں دیہی اور شہری طبقے کے غریب محنت کشوں کی نمائندہ نہ تھی۔ گاندھی کے سیاست میں آنے کے اور نام نہاد "عوامی سیاست" کے ابھرنے کے باوجود بھی اس صورتحال میں کوئی خاص تبدیلی نہ آئی سوائے اس کے کہ کانگریس نے کسانوں سے یہ بات کرنا شروع کی کہ وہ کانگریس کی حمایت کریں۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے کسانوں کے لئے بہت ہی کم بات کی۔ گاندھی نے یہ بات کر کے کہ زمیندار کسانوں کے محافظ نگران (trustees) ہیں، دراصل ایک ایسے فلسفے کو بڑھاوا دیا جس کے نتیجے میں کسانوں کی حیثیت صفر ہو کر رہ گئی۔ کانگریس کا "عوامی نمائندگی"(mass basis) کا دعویٰ محض ایک خیال (myth) ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلم لیگ اور ابتدائی کانگریس دونوں کے ابتدائی مطالبات میں طبقاتی طور پر بڑی حد تک یکسانیت نظر آتی ہے۔

مسلمانوں کی تحریک ہندوستان کی تاریخ میں کوئی منفرد اور الگ قسم کی تحریک نہ تھی۔ جنوبی ہندوستان کی ڈراوڑ(Dravidian) تحریک بڑی حد تک مسلمانوں کی تحریک سے قریب تر تھی۔ تامل ناڈو میں تنخواہ دار طبقے اور پیشہ ورانہ ملازمتوں میں برہمنوں کی بالادستی تھی۔ مدراس (چنائی) کی پریزڈنسی میں آبادی کا صرف چار فیصد ہونے کے باوجود برہمن یہاں کی بیشتر سرکاری ملازمتوں اور مقامی حکومتی دفاتر پر مکمل طور پر قابض تھے۔ اس صورتحال کے باعث غیر برہمن یا ڈراوڑ افراد کی اجارہ داری کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ ان کی اس بغاوت اور جداگانہ شناخت کے تصور کے پسِ پشت ۲۰ ویں صدی کے ابتدائی دو دہائیوں میں سامنے آنے والی اس حقیقت کا بڑا دخل تھا کہ جنوبی ہندوستان میں بولے جانے والی تمام زبانوں مثلاً تامل، تیلگو، ملائم

اور کانڑا کا تعلق دڑاورنسل کی منفرد زبانوں کے گروہ سے ہے اور ان زبانوں کا کسی بھی طرح ہندوستانی سنسکرت سے کوئی رشتہ نہیں۔ جنوبی ہندوستان میں آنے والی سنسکرت شمالی ہندوستان سے آنے والے برہمن اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس انکشاف کے نتیجے میں ڈروار تشخص کا ایک نیار جحان اُبھر کر سامنے آیا۔ دڑاور تحریک کا آغاز نومبر ۱۹۱۶ء میں اس وقت سامنے آیا جب برہمن مخالف انصاف پارٹی (Anti-Brahmin Justice Party) وجود میں آئی۔ ای وی رام سوامی نائیکر (E V Ramaswami Naiker) جنہیں بعدازاں پریار (Periyar) کے نام سے جانا جانے لگا، انہوں نے ایک دڑاور تحریک شروع کرنے کا اعلان کیا جس کا مقصد برہموں سے علیحدگی اختیار کرنا تھی۔ مدراس (چنائے) کے مسلم لیگ کے اجلاس میں اسے منچ (اسٹیج) پر بڑی نمایاں جگہ دی گئی۔ اس کی علیحدگی کی یہ تحریک کوئی نمایاں کامیابی تو حاصل نہ کر سکی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کا دائرہ کار تامل ناڈو سے آگے نہ بڑھا سکے۔ بہرحال اس کی تحریک نے تامل ناڈو کی سیاست کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔

مسلم لیگ جس کا قیام ۱۹۰۶ء میں سامنے آیا تھا۔ اس میں واضح تبدیلیاں ۱۹۱۰ء کے بعد سامنے آنا شروع ہوئیں۔ ایک مزید سخت گیر نقطہ نظر رکھنے والی مسلم لیگی نسل ایک بالکل ہی مختلف موڈ میں سامنے آنا شروع ہوئی۔ اب مسلم لیگ کی سماجی ساخت میں بھی واضح منتقلی (shift) نظر آنے لگی۔ اب اس میں شائستہ اور متوسط طبقوں کی شمولیت اور نمائندگی بھی نظر آنا شروع ہو گئی۔ اب بڑی قلیل تعداد جاگیردارانہ گھرانوں سے آ رہی تھی۔ اب اکثریت اس طبقے سے شامل ہو رہی تھی جس کی ذرائع آمدنی زیادہ تر زمین کے بہت قلیل کرائے سے حاصل ہونے والی آمدنی پر تھی۔ لیکن اس قلیل آمدنی کے گزراوقات کے لیے ناکافی ہونے کے باعث انہیں اب اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے سرکاری ملازمتیں اختیار کرنا پڑتیں یا پھر پیشہ ور بننا پڑتا (۱۵)۔ مسلم لیگ نے بالآخر اس طبقے کی صورت میں اپنے لیے مستقل گروہ اور حمایتی حاصل کر لیے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ جاگیردار مثلاً راجہ صاحب آف محمود آباد اور دیگر کئی کاروباری افراد اب بھی اس میں شامل تھے۔ اس نئی مسلم لیگ نے حکومت کی سرپرستی حاصل کرنے کے بجائے اس کی مخالفت مول لے لی۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ راجہ صاحب مسلم لیگ کی سیاست میں مزید محتاط اس وقت ہوئے جب گورنر میسٹن (Meston) نے ۱۹۱۶ء میں ان کی سیاسی سرگرمیوں کے

باعث ان سے ان کی تعلق داری کی سند چھیننے کی دھمکی دی۔

مسلم لیگ کی سیاست کا محور علی گڑھ کے رجعت پسندوں (conservatives) سے لکھنو کی نسبتاً زیادہ شدت پسند قیادت کی طرف منتقل ہو گیا حالانکہ اس نئی شدت پسند قیادت نے بھی اپنی تعلیم علی گڑھ سے ہی مکمل کی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں پر جوش اور زیادہ شدت پسند وزیر حسن نے مسلم لیگ کی سیکریٹری جنرل شپ سنبھال لی تھی۔ ان تبدیلیوں کے باعث مسلم لیگ کے طریقہ سیاست میں اور کانگریس کی طرف مسلم لیگ کے رویے میں بڑی واضح تبدیلی نظر آنے لگی۔ مطیع الرحمٰن لکھتے ہیں ''مسلم لیگ کی صفوں میں پیشہ ور افراد کی تعداد بڑھنے کے باعث لیگ کو اس بات کا فائدہ ہوا کہ ہندو کمیونٹی کی طرف اپنے تعلقات کو نئے طریقے سے استوار کرے'' (۱۶)۔ ۱۹۱۰ء تک مسلم لیگ کے دستور کو بڑی حد تک تبدیل کر کے اسے کانگریس کے متوازی لے آیا گیا سوائے چند تبدیلیوں کے جو کہ مسلمانوں کے جداگانہ طریقہ انتخاب اور مسلمانوں کی متناسب نمائندگی کے متعلق تھا۔ اب مسلم لیگ کی قیادت کو اس بات کا اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول میں کوئی نمایاں کامیابی اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ کانگریس کے ساتھ مل کر ایک متحدہ پلیٹ فارم نہیں بنا لیتے۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کی بات کی گئی۔

مسلم لیگ نے اب کسی ایسے شخص کی طرف دیکھنا شروع کیا جو کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان پل کا کام کر سکے۔ جناح ایک واضح نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ مسلم لیگ کا رکن نہ ہونے کے باوجود وہ لیگ کے ۱۹۱۲ء کے کونسل اجلاس میں خصوصی بلاوے پر شریک ہوئے تھے۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کے نئے اور زیادہ شدت پسند آئین پر کام کرنے کی بات کی گئی۔ جناح نے اس اجلاس میں کئی تجاویز دیں جنہیں بخوشی من وعن تسلیم کر لیا گیا (۱۷)۔ جناح کا اس وقت تک کانگریس میں بڑا اہم مرتبہ تھا جس کے باعث وہ دونوں پارٹیوں کو با آسانی ایک دوسرے کے قریب لا سکتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۳ء میں جب وزیر حسن اور مولانا محمد علی (جوہر) سیکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہندوستان سے ملنے کے لیے لندن آئے ہوئے تھے۔ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود سیکریٹری آف اسٹیٹ کے انکار کے بعد وہ لندن میں رہائش کے دوران جناح سے ملے۔ ان دونوں نے جناح کو اس ملاقات میں اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر کانگریس اور مسلم لیگ کے اتحاد کی کوششیں کریں۔ جناح اس بات پر راضی ہو گئے لیکن مسلم لیگ میں ان کی شمولیت اس بات سے

مشروط تھی کہ وہ ساتھ ہی کانگریس سے بھی اپنا ناطہ برقرار رکھیں گے۔

اکتوبر۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد جناح نے کانگریس۔لیگ اتحاد کے لیے بڑی شدت سے کوششیں کرنا شروع کر دیں۔ جس کا اختتام بالآخر ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے ایک مشترکہ اجلاس اور لکھنو معاہدہ کی صورت میں سامنے آیا(۱۸)۔اس معاہدے کی رُو سے کانگریس نے مسلمانوں کے مطالبات جن میں جداگانہ حق انتخاب اور صوبوں میں مسلمانوں کے لیے متناسب نمائندگی جیسے مطالبات کو تسلیم کرلیا گیا۔اس کے نتیجے میں

مسلمانوں کو اقلیتی صوبوں مثلاً یو پی کی کئی اضافی نشستیں حاصل ہوگئیں جو کہ مورلے میٹو اصلاحات میں دیئے گئے مجوزہ فارمولے سے کہیں زیادہ تھیں۔ یہ اضافی نشستیں لیگ کو اس قربانی کے نتیجے میں حاصل ہوئی تھیں جو کہ اس نے مسلمان اکثریتی صوبوں میں تسلیم کرلیا تھا۔ بنگال میں مسلمانوں کی ۵۲ فیصد آبادی ہونے کے باوجود لیگ نے ۴۰ فیصد نشستوں پر اکتفا کیا جبکہ پنجاب میں جہاں مسلمانوں کی آبادی ۵۴٫۸ فیصد تھی وہاں مسلمانوں کو ۵۰ فیصد نمائندگی ملی۔ جبکہ متحدہ صوبہ جات میں مسلمان اپنی صرف ۱۴ فیصد اقلیتی آبادی کے باوجود ۳۰ فیصد نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ آخر ایسا سودمند سودا کیوں نہ ہوتا کیونکہ یہ تمام معاملات یو پی کا طبقہ اشرافیہ چلا رہا تھا۔

معاہدہ لکھنؤ پر تنقید کرتے ہوئے ہمیں اس کی کامیابیوں کو کلی طور پر نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ یہ معاہدہ کانگریس اور مسلم لیگ کو برطانوی استعماریت کے خلاف متحدہ جنگ لڑنے کے لیے ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر لانے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ جناح اور مسلم لیگ ہی تھے جو کہ اس اتحاد کی خواہش رکھتے تھے اور اس کے لیے کوششیں بھی شروع کیں۔ جناح اتحاد کے خواہش مند تھے نہ کہ تقسیم کے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ جناح تمام تر مصائب کے باوجود ربع صدی تک اپنے اس انتہائی مشکل کردار کو بھرپور طریقے سے ادا کرتے ہوئے اتحاد کے لیے سرگرم عمل رہے اور اس دوران انہیں شدید دھچکے بھی لگے لیکن پچیس سال کی کاوشوں کے بعد بالآخر وہ مقام آ گیا جہاں ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود اتحاد ممکن نہ رہا۔

لکھنؤ معاہدے کے ذریعے مسلم لیگ اور کانگریس نے اپنے کئی مطالبات نوآبادیاتی سرکار تک پہنچائے۔ اس معاہدے میں یہ مطالبہ سامنے آیا کہ قانون ساز اسمبلی کے زیادہ تر اراکین کی

تعداد منتخب شدہ ہونی چاہیے۔ اس میں مطالبہ کیا گیا کہ صوبوں میں ۴/۵ فیصد نمائندے براہ راست انتخابی عمل سے گزر کر منتخب کیے جائیں جبکہ ۱/۵ فیصد اراکین کو سرکار نامزد کرے۔ اس کے ساتھ ہی کونسلوں کے اراکین بھی براہ راست انتخابی عمل کے ذریعے ایوانوں تک پہنچیں۔ اس طرح اس بات کا بھی مطالبہ کیا گیا کہ امپیریل قانون ساز کونسل کے بھی ۴/۵ فیصد اراکین براہ راست انتخابی عمل کے ذریعے منتخب کیے جائیں۔ یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ گورنر جنرل کی ایگزیکٹیو کونسل کے اراکین بھی انڈین ہونے چاہئیں اور ان کا انتخاب بھی امپیریل قانون ساز اسمبلی کے اراکین کے ووٹوں سے ہو۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو لکھنو معاہدے سے صرف مسلم لیگ ہی مستفید نہ ہوئی جو کہ عام طور سے تصور کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس معاہدے نے وہ بنیادیں فراہم کرنے کی کوششیں کیں جس کے ذریعے مسلم لیگ اور کانگریس متحد ہو کر آئندہ کام کر سکتے تھے۔ لکھنو معاہدے کی اہمیت اس بات سے کئی گنا زیادہ ہے جو کہ عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔

لکھنو معاہدہ کا سب سے اہم عنصر جداگانہ انتخاب کے اصول کو تسلیم کرنا تھا۔ جناح ہمیشہ سے مخلوط طریقۂ انتخاب کو فوقیت دیتے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں کانگریس کے سالانہ اجلاس میں انہوں نے جداگانہ انتخاب کی مخالفت میں قرارداد پیش کی تھی۔ لیکن بعد ازاں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرنے کے بعد اپنے مسلم لیگی دوستوں کو قائل کرنے میں ناکامی کے بعد بالآخر وہ اس بات کے حق میں ہو گئے جو کہ ان کے لیگی دوست چاہتے تھے۔ ان کی اس تبدیلی رائے کے پس پشت شاید یہ بات بھی تھی کہ مورلے منٹو اصلاحات میں جداگانہ حق رائے دہی کو بھی تسلیم کر لیا گیا تھا اور کانگریس کے کئی سینئر اراکین بھی اس خیال سے اصولی طور پر متفق ہو گئے تھے جیسا کہ بمل پرشاد بتاتے ہیں کہ ۱۹۱۱ء میں گوکھلے نے بھی یہ بات کر دی تھی کہ مسلمانوں کے لیے جداگانہ حق انتخاب میں کوئی حرج نہیں چونکہ مسلمان اراکین کسی خاطر خواہ تعداد میں قانون ساز کونسلوں میں نمائندگی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر مسلمانوں کی سیاسی تحریک میں شدت پسندانہ تبدیلی آتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی وجہ علماء کا دوبارہ متحرک ہونا اور مرکز سیاست میں نمایاں مقام حاصل کرنا تھا۔ گاندھی کی زیر نگرانی کام کرنے والی خلافت تحریک (۱۹۲۴ء۔۱۹۱۸ء) نے لکھنو معاہدے کے نتیجے میں مسلم لیگ اور کانگریس کے اتحاد اور مشترکہ سیاسی جدوجہد کے عزم کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔

اس تحریک نے مسلم لیگ کی سیکولر قیادت کو بھی شدید دھچکا لگایا۔ اس تحریک نے سنی مسلمانوں کے ایک شدت پسند گروہ دیوبندی فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کو اس غلط مفروضے کی بنیاد پر سیاست چمکانے کا موقع مل گیا کہ برطانوی سرکار مسلمانوں کی دشمن ہے اور وہ عثمانی خلافت کا خاتمہ چاہتی ہے۔ اس تحریک نے دیوبندی مسلمانوں کے ذہنوں میں دوبارہ پان اسلام ازم کے جذبات کو بڑھانے میں مدد کی۔ ان جذبات کا محور اس بات پر مرتکز تھا کہ عثمانی سلطان درحقیقت ایک عالمی (universal) خلیفہ ہے"۔ یہ نکتہ نظر حقیقت پر مبنی نہ تھا کیونکہ ہندوستانی مسلمانوں اکثریت چونکہ بریلوی فرقے کے پیروکار ہیں وہ عثمانی سلطان کو خلیفہ تسلیم نہیں کرتے۔ ہندوسان کے بریلوی مسلمان عرب قوم پرستوں کی طرح عثمانی سلطان کو اس بنا پر خلیفہ نہیں مانتے کیونکہ ان کا حسب ونسب قریش قبیلے سے تعلق نہیں رکھتا۔

تحریک خلاف کو بڑھاوا دینے کا موقع اس وقت حاصل ہوا جب اس کی قیادت گاندھی کے ہاتھ لگی۔ گاندھی کے اپنے بقول وہ اس تحریک کے آمر (dictator) بن گئے تھے۔ تحریک کے دیگر اکابرین بشمول عبدالباری فرنگی محل، انصاری، شوکت علی اور محمد علی گاندھی سے رہنمائی اور ہدایت لیتے تھے (۲۰)۔ یہ انتہائی مشکل اور پیچیدہ عمل ہوگا کہ اس تحریک میں گاندھی کے کردار کا جائزہ لیا جائے جو کہ اس تحریک کے نئے پیر (saint) بن گئے تھے۔ حالانکہ پہلی جنگ عظیم کے اختتام تک گاندھی اپنا سیاسی مقام بنانے کی کوشش کررہے تھے۔ ان کی تمام تر کوششوں کو دراصل اسی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے کہ ان کا مطمح نظر دراصل اپنے لیے نئے سیاسی مقام کی تلاش تھا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ تحریک خلاف اور تحریک عدم تعاون کے اختتام پر ہندوستان کی قوم پرست تحریک کے غیر متنازعہ لیڈر کے طور پر سامنے آگئے۔ گاندھی کی اس تحریک نے مسلم لیگ کی سیکولر قیادت کو شدید دھچکا لگایا اس کے بدلے مولویوں کو سیاست کرنے کا موقع ہاتھ لگ گیا۔ گاندھی نے مولویوں کو ۱۹۱۹ء میں ان کی ایک علیحدہ جماعت جمعیت علمائے ہند کے نام سے قائم کرنے میں بھی مدد کی۔ یہ وہ انتہا پسند اور سخت گیر بنیاد پرست تھے جو کہ بالآخر طالبان کو افغانستان میں عروج دلوانے کا باعث بنے۔

گاندھی کی کرم فرمائی سے خلافت تحریک پہلی مرتبہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاست میں مذہبی تنگ نظری کو داخل کرنے کا باعث بنی۔ اس عمل میں ایک اہم پیش رفت اس وقت ہوئی

جب انصاری نے مسلم لیگ کے ۱۹۲۸ء کے دہلی اجلاس میں مولویوں کو دعوت دینے کا اہتمام کیا۔ انصاری نے بحیثیت چیئرمین آل انڈیا مسلم لیگ استقبالیہ کمیٹی اجلاس سے ایک روز قبل دیگر مسلم لیگی رفقاء کو بتائے بغیر دو اہم مدرسوں (دیوبند اور فرنگی محل) کی مدد سے علماء کا ایک اجلاس بلا لیا۔ یہ لوگ دہلی کی فتح پوری مسجد میں اکٹھا ہوئے (۲۱)۔ اس اجلاس میں مولویوں کی جنونیت کو ہوا دی گئی تاکہ اگلے روز کے لیگی جلسے پر ان جنونیوں کو حاوی کروایا جائے۔ لیگ کے جلسے میں مولویوں کا یہ حملہ (جسے کئی لوگ مغالطے میں عوامی اظہار کہتے ہیں) خود لیگی قیادت کے لیے باعث حیرت تھا۔ اجلاس میں جب خلافت کے متعلق قرارداد پیش کی گئی تو لیگی اراکین کے لیے مولویوں کے تیور دیکھتے ہوئے یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ اس کی مخالفت کے لیے لب کشائی کریں۔ جناح نے اس ساری صورت حال کو دیکھتے ہوئے چند قانونی اور قواعد (procedural) پر اعتراضات اٹھائے۔ لیکن ان کو اندازہ تھا کہ وہ جنگ ہار چکے ہیں۔ اپنا احتجاج ریکارڈ کروانے کے لیے انہوں نے اجلاس سے واک آؤٹ کر دیا۔ جناح اور لیگی قیادت کے درمیان یہ بات طے ہو چکی تھی کہ اجلاس سے راجہ صاحب محمود آباد اور وزیر حسن بائیکاٹ نہیں کریں گے بلکہ وہ اجلاس میں رہ کر مولویوں کی قراردادوں کی بھرپور مخالفت کریں گے اور ان دونوں کو، صدر اور جنرل سیکریٹری کے عہدوں سے ہٹانے کی تمام کوششوں کو ناکام بنائیں گے۔ ان دونوں کی موجودگی کے باعث مولوی اپنی کئی متنازعہ قراردادیں بھی منظور نہ کروا سکے اور ان دونوں کو آئندہ مدت کے لیے دوبارہ مسلم لیگ کا صدر اور جنرل سیکریٹری باآسانی منتخب کر لیا گیا۔ لیکن بدقسمتی سے دونوں اراکین کو چند ماہ بعد ہی مستعفی ہونا پڑا کیونکہ وہ مسلم لیگ کے مولویوں سے متاثرہ ماحول میں اپنا کام جاری نہ رکھ سکتے تھے۔

تحریک خلافت اور سیاست میں مذہب کے داخل ہونے کا براہ راست نتیجہ ۱۹۲۰ء کی دہائی میں بدترین نوعیت کے فرقہ ورانہ فسادات (communal riots) تھے جن کی انڈیا کی تاریخ میں قبل ازیں نظیر شاذونادر ہی ملے۔ ۱۹۲۴ء میں ترکی کے عوامی نیشنلسٹوں نے مصطفےٰ کمال کی زیر قیادت عثمانی خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی خلافت کمیٹی جو کہ وقتی طور پر مسلم لیگ سے بھی زیادہ مضبوط ہو کر سامنے آئی تھی، مایوسی کا شکار ہو کر گمنامی میں چلی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ علماء کے سیاسی اثر و نفوذ میں فوری طور پر نمایاں کمی نظر آئی اور مسلم لیگ دوبارہ اپنے سیکولر ایجنڈا پر واپس پلٹ آئی۔ یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ اسلامی نظریاتی رجحان

(ideology) کو تقسیم کے بعد پاکستان میں بڑھاوا ملا۔ یہ تبدیلی درحقیقت مسلم لیگ کو اپنی جدوجہد کی اس وضاحت کے لیے اپنانا پڑی کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست کو جود میں لانے کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تقسیم سے قبل لیگی قیادت نے مسلم لیگ کے ایجنڈہ پر 'اسلامی نظریہ' کو متعارف کرانے کی تمام کوششوں کو بڑی سختی سے کچلنے (scotched) کی کوشش کیں (۲۲)۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تحریک کے سامنے سماجی گروہوں کے بڑے واضح اور ٹھوس مقاصد تھے اور وہ کسی بھی طرح کسی مبہم نظریہ (ideology) سے متاثر نہ تھی۔

جناح جلد ہی مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر لوٹ آئے۔ خلیق الزماں کے مطابق اب وقت آ گیا تھا کہ مسلم لیگ دوبارہ اپنا سیاسی کردار ادا کرنا شروع کرے کیونکہ خلافت کمیٹی پسپائی اختیار کر چکی تھی''......ہم نے فیصلہ کیا کہ جناح کو دوبارہ بلایا جائے اور ان سے مئی ۱۹۲۴ء میں لاہور میں مسلم لیگ کے سیشن کی صدارت کروائی جائے کیونکہ جناح دسمبر ۱۹۱۸ء کے اجلاس کے بائیکاٹ کے بعد لیگ کے صرف ایک ۱۹۱۹ء میں لکھنو والے اجلاس میں شریک ہوے تھے'' (۲۳)۔ بہرحال اس وقت تک ہندوستان کی صوبائی سیاست اور مسلم لیگ کے اقتدار کی کشش ثقل کا مرکز (Centre of gravity of power) بڑی گہری تبدیلی کی زد میں آ چکا تھا۔

جب مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو اس کے پس پشت یہ بات تھی کہ لیگ مسلمانوں کے مطالبات کو منوانے کے لیے ایک بھرپور اور طاقتور آواز بن کر ابھرے گی۔ منٹگو چیمفورڈ اصلاحات (Montegu-Chelmsford) نے ہندوستانی سیاست کے تمام حرکیات (dynamics) کو تبدیل کر کے رکھ دیا اور اب سیاست کا محور ہندو اکثریتی صوبوں (مثلاً یو پی) سے منتقل ہو کر مسلمان اکثریتی صوبوں کی طرف ہو گیا۔ یہ وہ صوبے تھے جہاں مسلمان اپنی حکومت قائم کر سکتے تھے۔

ان نئی اصلاحات کے نتیجے میں اب وزراء کو بے شک محدود سطح پر ہی کچھ اختیارات حاصل ہو گئے۔ اب انہیں وسائل اور ملازمتوں پر بڑا محدود سیاسی کردار ادا کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ اب سیاسی رہنما اور جماعتیں صرف پریشر گروپ کا کردار ادا کرنے تک محدود نہ رہیں بلکہ اب وہ سرپرستی بھی کر سکتی تھیں۔ مسلمان اقلیتی صوبوں میں مسلمان تنخواہ دار طبقے کا اثر و نفوذ کم ہونے لگا۔ مسلمان اکثریتی صوبے پنجاب اور بنگال عمومی طور پر اور پنجاب خصوصاً بڑی اہمیت کے حامل

ہو گیا۔ ڈیوڈ پیج (David Page) نے اس سلسلے میں اور خاص طور پر ہندوستان کی مسلم سیاست میں پنجاب کے غالب (dominant) کردار کے سامنے آنے پر کافی روشنی ڈالی ہے (۲۴)۔

اب سیاسی جماعتوں اور سیاست دانوں کے کردار کے لیے نئی منطق سامنے آ گئی۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں آنے والی اہم تبدیلی جسے کئی لوگ عام طور پر نظرانداز کر دیتے ہیں وہ مسلمانوں کی سیاست میں طبقاتی بنیادوں کی تبدیلی تھی۔ یہ تبدیلی پنجاب اور بنگال میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھی۔ پنجابی مسلمان، ہندو اور سکھ زمینداروں نے مشرقی پنجاب کے طاقتورانہ برادری نظام (چوہدری چھوٹو رام کی زیرِ قیادت) میں شمولیت اختیار کر لی جو کہ یونینسٹ پارٹی کے زیرِ اثر کام کر رہا تھا۔ ایک قابلِ ذکر آدمی سر فضل حسین جن کا تعلق شہری علاقوں کے درمیانے طبقے سے تھا (لیکن جو کہ جاگیردار طبقات کی ضروریات کو بڑی اچھی طرح سمجھتے تھے) وہ یونینسٹ پارٹی کی قیادت کر رہے تھے۔ سر فضل حسین نے پنجاب کے خفیف مسلمان تنخواہ دار طبقے کی سرپرستی کرنا شروع کی جس کا تعلق زیادہ تر دیہی علاقوں سے تھا۔ پنجاب کی شہری آبادی کا بیشتر حصہ ان تنخواہ دار ہندو طبقے، پیشہ ورانہ افراد اور تاجروں پر مشتمل تھا جن کا زیادہ تر تعلق ہندو مہاسبھا سے تھا۔ پنجاب میں مسلم لیگ کا بمشکل ہی وجود تھا۔ فضل حسین نے اس سے بھی اتحاد بنا لیا کیونکہ اس کا بھی کچھ نہ کچھ فائدہ تھا۔ فضل حسین بڑے تیز طرار اور عملی (pragmatic) سیاست دان تھے اور سیاسی لین دین (accomodation) پر یقین رکھنے والے شخص تھے لیکن یہ سب کچھ اس وقت تک برداشت کر سکتے تھے جب تک کہ ان کے بنیادی مفادات کا تحفظ ہو رہا ہو۔ ان کو جاگیردارانہ حلقوں کے ساتھ ساتھ نوآبادیاتی سرکار کی طرف سے بھی مکمل پشت پناہی حاصل تھی جس نے ان کے ہاتھوں کو بڑی حد تک مضبوط کر دیا تھا۔

جناح اور فضل حسین اور ان کی یونینسٹ پارٹی کے پاس ایک دوسرے کو دینے کے لیے کچھ نہ کچھ تھا۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ خاموش اتحاد میں داخل ہوئے حالانکہ دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے۔ یہ مفادات کی شادی (marriage of convenience) تھی۔ یونینسٹ پارٹی ایک سیکولر اور بین المذاہب گروہوں پر مشتمل ایک علاقائی جماعت تھی جس میں پنجاب کے جاگیردار، مسلمان، ہندو اور سکھ اور مزید یہ کہ مشرقی پنجاب کے نسبتاً خوشحال جاٹ کسانوں کی مضبوط برادریاں بھی شامل تھیں (۲۵)۔ پنجاب کے مقناطیسی جاگیردار

(landed magnats) اپنی سوچ میں مقامی (Parochial) اور برطانوی راج میں پنجاب کی خودمختاری کے خواہش مند (hankered) تھے۔ وہ نوآبادیاتی سرکار کی زیرِ سرپرستی بڑی ترقی کررہے تھے اور اس کے بڑے ہی وفادار تھے۔ پنجاب کی اس سیاسی کلاس نے صوبے کے مخصوص جاگیردارانہ سیاست اور متفرق مذہبی گروہوں کی موجودگی کے باعث بہتر یہی جانا کہ اپنی سیاست کو صرف پنجاب تک محدود رکھیں اور صوبے سے باہر نہ نکلیں کیونکہ اس صورت میں دیگر علاقوں کے مسائل ان کے صوبے پر بھی اثر انداز ہوسکتے تھے۔ جناح کی مسلم لیگ وہ ذریعہ تھی جس کے ذریعے وہ پورے انڈیا میں ہونے والی تبدیلیوں کا حصہ بن سکتے تھے لیکن یونینسٹ پارٹی کی شرائط پر۔ سرفضل حسین اور بعدازاں ان کے جانشین سرسکندر حیات خان نے یہ منصوبہ بندی کی ہوئی تھی کہ وہ پنجاب مسلم لیگ کو مکمل طور پر اپنے زیرِ کنٹرول رکھیں گے۔

جناح ہر صورت میں یونینسٹوں کا ساتھ چاہتے تھے۔ وہ اس وقت تک ہندوستان کے مسلمانوں کی مکمل نمائندگی کے دعوی دار نہیں ہوسکتے تھے جب تک پنجاب ان کی پشت پر نہ ہو۔ وہ چاہتے تھے یونینسٹ اس بات کا اعلان کریں کہ ان کی حکومت مسلم لیگ کی حکومت تھی۔ مسلم لیگ کے لیے یہ بات کوئی خاص اہمیت کی حامل نہ تھی کہ چاہے اس عمل سے یہ تاثر ہی کیوں نہ ملے کہ یہ بات افسانہ (fiction) تھی۔ جناح پنجاب پر حکمرانی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کا صرف خدشہ اور خواہش یہ تھی کہ وہ کسی بھی طرح اپنے آپ کو ہندوستان کے تمام مسلمانوں کا نمائندہ ثابت کرسکیں۔ پنجاب میں مسلم لیگ کا اپنا بمشکل ہی وجود تھا۔ حد تو یہ ہے کہ خلیق الزماں نے فروری ۱۹۴۰ء میں یہ بات کہی کہ ''ہم نے پنجاب میں مسلم لیگ کو قائم کرنے (formationj) کے موضوع پر بات چیت کی'' (ایضاً ۲۳۳)

کئی طاقتور یونینسٹوں نے تو پنجاب کے لیے ایک محدود آزاد ریاست (dominion) کا خواب دیکھنا شروع کردیا تھا۔ جیسا کہ نور محمد نے بتایا ہے کہ سرسکندر نے ۲۔۱۹۴۱ء کے موسم گرما میں ونسٹن چرچل سے قاہرہ میں ملاقات کی (۲۶)۔ اس ملاقات سے واپسی پر سرسکندر حیات نے اپنی کابینہ کے رفقاء کو بتایا کہ انہوں نے چرچل کو یہ تجویز دی ہے کہ پنجاب کے وفادار اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ انہیں آزاد dominion کا حق دیا جائے یا پھر انہیں اس آزاد dominion کا حصہ بنایا جائے جس میں سندھ، بلوچستان اور شمالی سرحدی صوبہ (موجودہ خیبر پختونخواہ) شامل

ہوں۔ان کے خیال میں پنجاب اس ڈومینین کو باآسانی کنٹرول کرسکتا تھا۔سکندر حیات نے کہا کہ وہ نہیں جانتے کہ چرچل کو ان کے دلائل نے کس حد تک متاثر کیا لیکن یہ اہم بات ہے کہ مارچ ۱۹۴۲ء کو اپنی ایک تجویز میں چرچل نے اس بات کی طرف پہلی مرتبہ اشارہ کیا کہ ہندوستان کے صوبوں کو اس بات کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ الگ ڈومینین حیثیت اختیار کرسکیں۔کئی یونینسٹوں کو توقع تھی کہ انہیں ہندوؤں اور سکھوں کی مدد سے پنجاب کی ایک آزاد حکومت قائم کرنے کی اجازت دے دی جائے گی اور اس مقصد کے حصول کے لیے سر خضر حیات ٹوانہ اپنی وزارت عظمیٰ کی قربانی بھی دینے کو تیار ہو گئے تھے۔

بنگال کی صورت حال کافی مشکل تھی۔بنگال زیادہ تر چھوٹے کسانوں (بیشتر مسلمانوں) کی سرزمین تھا۔۱۹۱۱ء میں جب مشرقی بنگال کی مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تو اس کی زیادہ تر قیادت کا تعلق یو پی کے اردو/فارسی بولنے والے مہاجرین مسلمان اشرافیہ پر مشتمل تھی جن کا بنگال کے کسانوں سے کوئی دور کا بھی تعلق نہ تھا۔اس کی ایک بڑی واضح مثال ڈھاکہ کے نواب خاندان کی تھی۔لیکن پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر ایک زیادہ متحرک پیشہ ور طبقہ سامنے آیا جس کا تعلق زمیندار طبقے کے بجائے خوشحال کسانوں سے تھا۔ان نئے لوگوں نے قیادت سنبھال لی۔ان میں فضل الحق بھی شامل تھے۔جنہوں نے نسبتاً خوشحال کسانوں کو متحرک کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔شمالی بنگال میں کسان پرا جا (praja) بڑے کرایہ دار (جوتیداروں) سے بالکل جدا تھے۔جو کہ اپنی زمینوں کو شراکت داروں (sharecoppers) بردگار (bhargadars) کے ذریعے آباد کرواتے تھے۔جبکہ جنوب میں متحرک ڈیلٹا (active delta) میں قلیل زمین مالکان کی اکثریت تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر سامنے آنے والی صورت حال کے نتیجے میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والے طبقات میں بنگال کا مسلمان کاشت کار اور تنخواہ دار اور شہروں کے غرباء شامل تھے جو کہ اس جنگ کے بعد تباہ حال اقتصادی صورت حال سے بڑی بُری طرح متاثر ہوئے (۲۷)۔

بنگال کی زرعی پیداوار جوٹ نے جو کہ ایک نقد فصل تھی، اور جس نے بنگال کی اقتصادیات کو عالمی اقتصادیات سے جوڑ رکھا تھا۔اس نظام پیداوار نے صوبے کی اقتصادیات کو بڑی حد تک منڈی کی اتار چڑھاؤ (نشیب و فراز) کے باعث اسے خطرے سے دوچار کردیا تھا۔

ان اقتصادی دباؤ کے باعث بنگال کی مسلمان سیاست میں مزید شدت پسندی آ گئی۔اس

بات کی فوری ضرورت تھی کہ کرایہ داری(Tenancy laws) کے قوانین میں تبدیلی لائی جائے۔تمام صوبوں میں ہونے والے احتجاج کے باعث بالآخر نوآبادیاتی سرکار کو کرایہ داری کے قانون میں ۱۹۲۳ء میں تبدیلی لانا پڑی۔بنگال کے مسلمان تنخواہ دار طبقے کی سربراہی کرنے والوں میں موجود انتہا پسند عناصر، چھوٹے کاشت کاروں اور جوتیداروں نے کرایہ تبدیلی کے اس بل کی بھرپور حمایت کی لیکن بدقسمتی سے ہندو زمینداروں کے زیر اثر کام کرنے والی جماعت کانگریس، سوراج جماعت نے بڑی مہارت سے اس قانون کو مسترد کروادیا۔کانگریس کی لیڈرشپ نے بھی اپنے تمام تر دعووں کے باوجود بڑی بے شرمی سے پرجیوی parasitical زمینداروں کی حمایت کی۔

۱۹۲۰ء کی دھائی کے آخر تک فضل الحق اور مسلمانوں کی نئی نسل کی قیادت نے بنگالی کرایہ داروں کو متحرک کرنا شروع کر دیا تھا۔انڈین قوم پرست تاریخ دانوں نے بنگال کی کسان تحریک کے طبقاتی عنصر (مثلاً زمیندار عمومی طور پر ہندو) کو بالکل نظرانداز کرتے ہوئے اس سارے معاملے کو خالصتاً فرقہ ورانہ انداز میں دیکھنے کی کوشش کی۔بہرحال ۱۹۲۰ء کی دھائی میں اچانک پرجا (کرایہ دار) تحریک کے مقابل میں سامنے والی تحریک نکھل بنگا پرجا ساتھی (کل بنگال کرایہ دار جماعت)(Nikhil Banga Praja Samity) کو فضل الحق اور نئی ابھر کر سامنے آنے والی قیادت نے آگے چلایا۔بنگال مسلم لیگ کی قیادت بھی ان کے زیر اثر آ گئی۔مسلمان زمینداروں نے جو کہ اس تحریک کی مخالفت کر رہے تھے انہوں نے چوٹی کے پیشہ ور افراد سے مل کر ایک نئی قیادت متحدہ مسلم جماعت(United Muslim Party) بنانے کا اعلان کر دیا۔سہروردی کو اس کا سیکریٹری چن لیا گیا جبکہ خواجہ ناظم الدین کو کلیدی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔جناح کے لیے اس مرحلے پر پنجاب کی طرح یہاں بھی یہی فکر کرنے کی بات یہ تھی کہ وہ کسی بھی طرح مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت اور اپنے آپ کو مسلمانوں کا واحد لیڈر ہونے کے دعوے کو ثابت کر سکیں۔اسی لیے انہوں نے دونوں گروہوں کے درمیان بنگال کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے اصول کے تحت مصالحتی کردار ادا کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔نکھل بنگا پرجا ساتھی نے ۱۹۳۶ء میں اپنا نام تبدیل کر کے کرشیک پرجا جماعت (Krishak Praja Party) رکھ لیا اور ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں حصہ لینے کی تیاریاں شروع کر دیں۔اس جماعت کا مرکزی ایجنڈا بغیر ادائیگی معاوضے کے فوری طور پر زمینداری کا خاتمہ تھا۔

کرشیک پارٹی اپنی چھٹی بورژوا قیادت سمیت غریب کسانوں پر کوئی خاص اثر ڈالنے میں ناکام رہی اور ۳۰ فیصد سے تھوڑی ہی زیادہ نشستیں حاصل کر سکی۔ اس ناکامی کی ذمہ داری انہوں نے ووٹنگ قوانین کی بے جا پابندیوں پر ڈالی۔ ان کے اس حیلے اور دلیل میں کوئی سچائی نہ تھی کیونکہ ان قوانین کی موجودگی میں ۱۹۴۶ء میں ہی مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری عبدالہاشم نے مسلم لیگ کی شاندار کامیابی کو یقینی بنایا تھا۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت وہ شخص جو گاؤں کی چوکیداری قانون کے تحت چھ آنے (ایک روپیہ ۱۶ آنے) کی ادائیگی کرتا تھا وہ ووٹ کا حقدار تھا۔ یہ اس قانون کا سب سے کم تر درجہ تھا جس کے تحت غریب کسان سوائے بے زمین کسانوں کے بھی ووٹ کے حقدار ٹھہرے۔ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ پر زمینداروں کی گرفت مضبوط تھی جنہوں نے حکمرانوں کی ۳۰ فیصد سے زائد نشستیں حاصل کر لیں جبکہ ۳۵ فیصد نشستیں آزاد اراکین کے حصے میں آئیں۔ مسلم لیگ نے کرشیک پارٹی کے ساتھ مل کر ایک مخلوط حکومت تشکیل دی جس میں فضل الحق کو وزیراعظم مقرر کیا گیا۔ اس مخلوط حکومت میں شراکت داری کے باعث مسلم لیگ اور جناح بمشکل اپنے اس دعوے کو بچانے میں کامیاب ہوئے کہ وہ آل انڈین مسلم لیگ اور وہ خود مسلمانوں کے واحد نمائندہ ہیں۔ بنگال وہ واحد صوبہ تھا جہاں مسلم لیگ نے ڈھاکہ کے نواب کے خاندانی اثرونفوذ کے باعث ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں ایک قابل عزت کامیابی حاصل کر لی تھی۔ جبکہ دیگر مقامات پر اسے ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔ سائمن کمیشن کی تقرری کو ہندوستان کے تمام عوامی طبقات نے عمومی طور پر مسترد کر دیا۔ جناح نے اس کے ردعمل میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف مشترکہ جدوجہد شروع کرنے کی ایک نئی امید تلاش کر لی۔ کانگریس کے صدر شری نِواس النگر (Srinives Iyengar) سے مشورہ کرنے کے بعد جناح نے مسلمانوں کے ۳۰ چیدہ اور نمایاں رہنماؤں کی ایک کانفرنس بلائی تاکہ مستقبل کے لائحہ عمل کے بارے میں صلاح مشورہ کیا جا سکے۔ اس مشاورت کے نتیجے میں سامنے آنے والی تجاویز کو دہلی مسلمان تجاویز (Dehli Muslim Proposals) کا نام دیا گیا (۲۸)۔ دونوں جماعتوں کے اتحاد میں حائل مشکلات پر قابو پانے کے لیے جناح نے اپنے تمام تر اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے تمام لیگی رفقاء کو مخلوط طریقہ انتخاب (جس کو وہ ہمیشہ فوقیت دیتے رہے تھے) پر اس شرط کے تحت راضی کر لیا کہ مسلمانوں کو بنگال اور پنجاب میں ان کی آبادی کے تناسب سے

نشستیں دی جائیں گی اور مرکزی قانون ساز اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی تین چوتھائی سے کم نہ ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ کانگریس کی منظوری سے مشروط دو دیگر شرائط بھی رکھی گئیں (۱) سندھ کو بمبئی (ممبئی) سے جدا کر کے اسے ایک مکمل صوبے کی حیثیت دے دی جائے گی۔ اور اس شمالی سرحدی صوبے (خیبر پختونخواہ) اور بلوچستان میں اصلاحات نافذ کر کے ان دونوں کو بھی ہندوستان کے دیگر صوبوں کے مساوی لایا جائے گا۔ ان تجاویز کو کلی طور پر یا تو قبول یا پھر مسترد ہونا تھا۔

بیشتر مسلم لیگیوں کا بغیر کسی ٹھوس وجوہات کے یہ خیال تھا کہ مخلوط طریقہ انتخاب ان کے خلاف جائے گا۔ فضل حسن کے زیر کفیل (protege) سر محمد شفیع نے پنجاب مسلم لیگ میں دراڑیں ڈال کر اپنی الگ اور جدا مسلم لیگ بنالی اور لاہور میں اس کا اجلاس بھی منعقد کر لیا۔ شفیع نے بالکل درست کہا تھا کہ جناح نے مسلمانوں میں جداگانہ انتخاب کے خاتمے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مخالفت کا مکمل طرح سے اندازہ نہیں لگایا۔ بہرحال اس نازک مرحلے پر مسلم لیگ کونسل کے اراکین کی ایک بڑی تعداد اس معاملے پر اپنے تمام تر تحفظات کے باوجود جناح سے وفادار رہی۔ دہلی تجاویز کے متعلق اعلان کرتے ہوئے جناح نے بہرحال خود اس بات کو تسلیم کیا کہ مسلمانوں کی اکثریت یہ بات سمجھتی ہے کہ صرف جداگانہ طریقہ انتخاب ہی ان کے مفادات کو تحفظ فراہم کر سکتا ہے" (۲۹) اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی اہم ہے کہ شفیع لیگ اور یونینسٹ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے مخالف تھے۔ فضل حسن اس بات پر مصر تھے کہ وہ کسی بھی طرح جناح کو تنہا کر دیں لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

دہلی تجاویز پر موتی لال نہرو کمیٹی نے غور شروع کیا۔ اس کمیٹی کو دہلی کل انڈیا جماعتوں کی کانفرنس نے "ہندوستان کے دستور کے لیے اصول طے کرنے" کے لیے فروری ۱۹۲۸ء میں مقرر کیا تھا۔ کمیٹی نے اپنی تجویز میں بالغ رائے دہی کو مخلوط طریقہ انتخاب کے تحت اپنانے کی تجویز دی۔ یہ بھی سفارش کی گئی کہ مسلمانوں کے لیے اقلیتی صوبوں میں نشستیں مختص کی جائیں لیکن اکثریتی صوبوں (بنگال اور پنجاب) میں مسلمانوں کی نشستیں مختص کرنے کی تجویز کو رد کر دیا گیا۔ اسی اصول کے تحت شمالی سرحدی صوبے (خیبر پختونخواہ) میں جہاں ہندو اقلیت میں تھے ان کے لیے نشستیں مختص کرنے کی تجویز دی گئی۔ کمیٹی نے اس تجویز کی بھی بھرپور حمایت کی کہ سندھ کو بمبئی (ممبئی) سے الگ کر کے ایک جدا صوبے کی حیثیت دی جائے جبکہ بلوچستان اور شمالی سرحدی

صوبے (خیبر پختونخواہ) کو مکمل صوبوں کے درجے دیئے جائیں۔ لیکن اگست ۱۹۲۸ء کے لکھنو کنونشن میں جہاں مسلم لیگ کی کوئی نمائندگی نہ تھی (۳۰) وہاں کمیٹی کی اصل تجاویز میں بڑی اہم تبدیلیاں ہندو مہاسبھا کے کہنے پر کردی گئیں۔ مہاسبھا اس اجلاس پر مکمل طور پر حاوی تھی۔ بعدازاں کلکتہ کے دسمبر ۱۹۲۸ء کے دس روزہ کنونشن میں ان تمام معاملات پر ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ کے درمیان کافی نوک جھونک (لے دے) ہوئی۔ نہایت افسوس کی بات تھی کہ اپنی سابقہ یقین دہانیوں کے باوجود کانگریس اب سندھ، بلوچستان، اور شمالی سرحدی صوبے کے معاملات میں اپنی بات پر قائم نہ رہی۔ کانگریس کے وفد نے اجلاس/کنونشن میں بھرپور حصہ لینے کے بجائے خاموشی اختیار کرتے ہوئے نمائشی کردار ادا کیا۔ ہندو مہاسبھا نے ان معاملات پر بات چیت کو یہ کہہ کر مسترد کردیا) کہ ان پر بات پہلے ہی لکھنو میں ہوچکی ہے۔ جناح کا کہنا تھا کہ مسلم لیگ کو لکھنو کے اجلاس میں نمائندگی نہیں دی گئی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے یہ بات کہی جانے گی کہ کانگریس اس کنونشن میں مہاسبھا کے ساتھ مل گئی اور اس نے نہرو کمیٹی کی اصل تجاویز سے انحراف کا راستہ اپنایا۔ ہندو مہاسبھا صوبوں کی جمہوری طریقۂ کار کے تحت تشکیل نو کو تسلیم کرنے کے بجائے جداگانہ طریقۂ انتخاب کو تسلیم کرنے کے لیے تیار تھی۔

جناح کے لیے کانگریس کی طرف سے یہ غداری ایک بہت بڑا جھٹکا تھا۔ جناح نے اتحاد کے حصول کے لیے اپنے مسلمان حمایتیوں کی مخالفت مول لیتے ہوئے اور تنہائی تسلیم کرتے ہوئے جداگانہ طریقہ انتخاب سے اپنی دستبرداری کا اعلان کیا تھا۔ اس مرحلے پر ان کی شادی میں ناکامی نے انہیں مزید سختی اور تنہائی کا شکار کردیا۔ یہ تبدیلی کا مرحلہ تھا اور بعد میں ہونے والے واقعات نے کانگریس سے ان کی مکمل علیحدگی کے معاملات کو تیزی سے آگے بڑھادیا۔

۱۹۳۷ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی بری طرح ناکامی اور کانگریس کی کامیابی کے نتیجے میں کانگریس کی دائیں بازو کی بننے والی وزارتوں کے رویوں نے مسلمانوں میں فرقہ وارانہ نفرتوں کے خوف کو جگہ دے دی۔ ان تمام عناصر نے مل کر جناح اور مسلم لیگ کے اس یقین کو بالکل ختم کردیا جو کہ وہ اب تک کانگریس سے لگائے بیٹھے تھے۔ خاص طور پر وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مہاسبھا کے زیر اثر اب کانگریس آزادانہ طور پر مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے کوئی یقین دہانی نہیں کرا سکے گی۔

اس صورتحال میں جہاں مہا سبھا کو کانگریس کی فیصلہ سازی کے عمل میں فیصلہ کن حق استرداد (veto) کا کردار حاصل ہو گیا۔ اس صورتحال میں جناح مکمل طور پر disillused ہو گئے تھے۔ اب رویے میں کانگریس کے ساتھ تعاون اور اتحاد کے بجائے دشمنی جھلکنے لگی۔ انڈین نیشنلسٹ تاریخ دان جناح کے اس رویے میں نمایاں تبدیلی کو ان کے ذاتی عزائم (ambitions) اور ضدی پن (intransigence) سے تعبیر کرتے ہیں جو کہ من و عن (axiomatic) طور پر تسلیم کر لی جاتی ہیں۔ اگر ہم سکون اور غیر جانبداری (dispassionately) سے انڈین تاریخ میں جناح کے کردار کا جائزہ لیں تو یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ وہ طے شدہ اصولوں کے تحت ہندوستان میں قومی یکجہتی کے قائل تھے چاہے اس کے عوض ان کو اپنی ذاتی حیثیت اور مقام کی بھی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ جناح کے لیے علیحدگی کی سوچ کا مرحلہ کلکتہ (کولکتہ) اجلاس میں ہونے والے دغا اور دھوکہ کے بعد آیا۔ اب واپسی کا کوئی راستہ نہ تھا۔

مہا سبھا کے زیر اثر آئی ہوئی کانگریس سے اب مسلمانوں کے معاملات پر مفاہمت کی بہت کم امید باقی بچی تھی۔ اب بات علیحدہ اور جداگانہ سرزمین کے لیے شروع ہو گئی۔ یہ ان معاملات کی انتہا تھی جس کے نتیجے میں ۱۹۴۰ء میں ''قرارداد پاکستان'' منظور کی گئی۔ اس کے تمام مضمرات اب تک واضح نہیں ہیں، خاص طور پر پاکستان میں کوئی بھی شخص صرف اس بات سے الجھاؤ (mystified) میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ اس قرارداد میں مرکز کی مجوزہ شکل کے بارے میں کوئی ذکر نہ تھا۔ کچھ دانشوروں کا کہنا ہے کہ یہ الجھاو دانستہ طور پر رکھا گیا تھا تاکہ مستقبل میں بات چیت کی گنجائش رکھی جا سکے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ متبادل راستے کون سے تھے؟ مستقبل کی راہیں مکمل طور پر (overdetermined) پنجاب کے مافیا (barons) جاگیرداروں کے خوف اور خدشات سے وابستہ تھیں۔ ان کے لیے تقسیم اب صرف واحد قابل قبول حل تھا۔ یہ صورتحال جناح جیسے کھرے (formidable) مذاکرات کرنے والے (negotiator) شخص کے بس سے باہر ہو چکی تھی۔ موت ہو چکی تھی۔ (The die was cast) اس بات میں کچھ الجھاؤ نہ تھا کہ برطانیہ کے تسلط کا خاتمہ قریب تھا۔ لیکن اس کے خاتمے پر حق حکمرانی کانگریس کو حاصل ہونا تھا جو کہ جاگیردارانہ نظام کے خاتمے پر مکمل یقین رکھتی تھی۔ اگر کانگریس کو سندھ اور پنجاب میں اقتدار حاصل ہوتا تو وہ وہاں جاگیرداری نظام کا خاتمہ کر دیتی۔ کیمبرج کے تعلیم یافتہ ممتاز دولتانہ وہ پہلے

شخص تھے جنہوں نے ۱۹۴۳ء میں صورتحال کو بھانپتے ہوئے یونینسٹ پارٹی کے ڈوبتے ہوئے جہاز سے چھلانگ لگادی۔ دوسروں نے فوراً ان کی پیروی کی۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا کہ وہ پنجاب میں مسلم لیگ پر قابض ہو جائیں اور تقسیم ہند کی تحریک میں زور وشور سے حصہ لینا شروع کردیں۔ پنجاب کے جاگیرداروں کا کانگریس کی زرعی اصلاحات کے متعلق خدشات اور پریشانیوں کا اظہار فیروز خان نے خود اس مصنف سے فروری ۱۹۵۱ء میں ذاتی طور پر ڈھاکہ میں دوران ملاقات اس وقت کیا جبکہ وہ مشرقی پاکستان کے گورنر تھے۔ ایک غیر رسمی ظہرانے میں جس میں انہوں نے مجھے مدعو کیا تھا جب ہماری بات چیت کے دوران ایک مقام پر نہرو کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا ''جواہر لعل ایک اچھے خاندانی پس منظر سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن بد قسمتی سے کیمونسٹوں اور سوشلسٹوں نے انہیں اپنے نرغے میں لیا ہوا تھا۔ اور وہ ہندوستان کے عظیم جاگیردارانہ خاندانوں کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ اب تمہیں چھو بھی نہیں سکتے''۔

۱۹۴۵ء تک یونینسٹوں کی ایک کثیر تعداد مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر چکی تھی اور آئندہ انتخابات میں اپنے حلقوں میں مسلم لیگ کی ٹکٹ پر انتخابات لڑنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں جناح صاحب سندھ میں ایک بڑے جاگیردار غلام حسین ہدایت اللہ کی سرکار کو اپنی آشیرباد دے چکے تھے۔ مسلم لیگ کی آشیرباد سے ان کی وزارت قائم رہی۔ جناح ان سب کو حقیر گردانتے ہوئے نفرت کرتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کے پاس اس کے لیے کوئی اور چارہ نہ تھا۔ درحقیقت یہ Indus Plain کے مقناطیسی جاگیرداروں کی قوت اور بنگال میں برپا ہونے والی بھرپور مہم کا ہی نتیجہ جس نے ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو بھرپور کامیابی دلوائی اور پاکستان کے قیام کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ مذہبی نظریہ بندی نے اس سلسلے میں کوئی کردار ادا نہ کیا اور درحقیقت پہلے بھی اس نے کوئی کردار نہیں ادا کیا تھا سوائے ایک انتہائی مختصر وقت کے لیے جب گاندھی کی زیر قیادت خلافت تحریک چلائی گئی۔ سندھ اور پنجاب کے پیروں (saints) کے ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں کردار کو دیکھتے ہوئے کچھ تاریخ دانوں نے غلطی سے یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ پاکستان کی تحریک کے پس پشت مذہب کام کر رہا تھا۔ اس بات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پیر اور گدی نشین جو کہ خود بڑے جاگیردار تھے وہ بھی کانگریس کی زرعی اصلاحات کے ایجنڈا سے سخت نالاں اور پریشان تھے۔ بہرحال اپنے مذہبی اثر ونفوذ کے باعث انہوں نے اپنے مسلمان

پیروکاروں کو اس بات کی ہدایت کی کہ وہ مسلم لیگ کے حق میں ووٹ ڈالیں۔

ایک اور myth علی گڑھ کے طلبہ کے متعلق پائی جاتی ہے کہ جنہوں نے سندھ اور پنجاب کے دورے کر کے وہاں کے کسانوں کو متحرک کیا۔ علی گڑھ کے طلبہ کا ایک گروہ بے شک ایک چکر لگانے گیا جن میں سے کچھ سے میری ذاتی ملاقات بھی ہوئی۔ درحقیقت جاگیرداروں یا ان کے وکلاء نے ان کے ان دوروں کا انتظام کیا۔ طلباء کے اس وفد نے کچھ اضلاع یا ان کے بھی چند شہروں میں ایک دو تقاریر کیں۔ وہ لوگ جنہیں سندھ اور پنجاب کے جاگیردارانہ سماج کے طریقہ کار کا مکمل ادراک نہیں کیا وہ اس قسم کے دورے کو 'وسیع عوامی رابطے' کا نام دے دیتے ہیں۔

بنگال میں صورتحال بالکل مختلف تھی۔ مسلمان جاگیردارانہ خاندان ابتدا سے ہی مسلم لیگ کی قیادت پر قابض تھے۔ مسلم لیگ کی جاگیردارانہ قیادت کو حقیقی للکار کا سامنا فضل حق اور کرشک پارٹی سے درپیش ہوا۔ جو کہ خوشحال کاشتکاروں میں ایک مضبوط بنیاد رکھتی تھی۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد مسلم لیگ اور کرشک پرجا پارٹی نے ایک مخلوط سرکار بنائی۔ یہ مخلوط حکومت دو بالکل متضاد مفادات رکھنے والے گروہوں کا اتحاد تھا۔ فضل حق جلد ہی تنہائی کا شکار ہو گئے۔ اس وقت تک (۱۹۳۸ء) بنگال وزارت کے ایک وزیر ایچ ایس سہروردی مسلم لیگ کی تنظیم نو کی ذمہ داری سنبھال چکے تھے۔ ۱۹۴۳ء میں ابوالہاشم جو کہ اسلام اور سوشلزم کے الجھے ہوئے خیالات کا مرکب تھے وہ پارٹی کے سیکریٹری منتخب ہو چکے تھے۔ سہروردی اور ابوالہاشم نے ایک متحدہ اور آزاد بنگال کی ریاست کے لیے ایک تحریک شروع کی جس میں انہیں جناح اور بنگال کی کانگریس کے سرت بوس (Sarat Bose) دھڑے کی بھرپور تائید حاصل تھی۔ لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ ۴۶۔۱۹۴۵ء کے انتخابات کی مہم کے دوران جب سہروردی نے اپنے آپ کو کلکتہ میں مصروف رکھا تو ابوالہاشم نے اس دوران بنگال کے کسانوں میں غیر معمولی اور بھرپور تحریک اقتصادی مسائل پر چلائی۔ اس بھرپور مہم کے نتیجے میں بالآخر مسلم لیگ کو ان انتخابات کے نتیجے میں بھرپور کامیابی حاصل ہوئی۔ مذہبی نظریہ سازی نے اس میں بھی کوئی کردار ادا نہیں کیا تھا۔

بنگال میں جہاں مسلمان کاشت کار اکثریت میں تھا وہ نوآبادیاتی (عالمگیر) نقد اقتصادیات کے ساتھ مکمل طور پر منتھی ہو چکی تھی۔ ان مسلمان کاشت کاروں کا فوری تضاد ان تاجروں اور ساہوکاروں سے تھا جو کہ زیادہ تر ہندو تھے۔ اس بات کا سہرا (tribute) مسلم لیگ کی قیادت اور

خاص طور پر ابوالہاشم کو جاتا ہے کہ جنہوں نے انتخابات میں اقتصادی معاملات پر تو بات چیت کی لیکن اس کے باوجود اس تضاد کو کسی بھی صورت ہندو۔ مسلم فرقہ ورانہ مسئلہ بننے نہ دیا۔ بہر حال تمام تر احتیاط کے باوجود، چند مقامات پر اکادکا واقعات رونما ہوئے۔ ان انتخابات میں دیگر معاملات کے ساتھ ساتھ ایک اہم معاہدہ وہ تھا جس میں کسانوں کا یہ مطالبہ بھی شامل تھا کہ کسانوں پر ساہوکاروں کے بھاری قرضوں کو ختم کیا جائے۔ اس مہم میں ابوالہاشم اور مسلم لیگ کی طرف سے اس بات کا بھی وعدہ کیا گیا کہ وہ عام لوگوں کو تاجروں کے استحصالی ہتھکنڈوں سے بھی نجات دلوائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ زمینداری نظام کے بلا معاوضہ فوری خاتمے کا مطالبہ بھی اس انتخابی مہم کا حصہ تھا۔ یہ مطالبہ بالآخر ۱۹۵۱ء میں پورا کیا گیا۔

۱۹۳۷ء کے برعکس یہ انتخابات (۱۹۴۶ء) نہایت غریب کسانوں کی دسترس تک بھی پہنچے۔ بنگالی مسلم لیگ نے ان انتخابات میں مسلمانوں کی ۱۲۱ مختص نشستوں میں سے ۱۱۴ پر کامیابی حاصل کی جبکہ ۱۹۳۷ء میں اسے صرف ۳۹ نشستیں حاصل ہوئیں تھی۔ بہر حال ابوالہاشم نے دائیں بازو کے نہایت طاقتور سیاستدانو ، کر مقصد کے لیے بڑا اہم کام کردکھایا تھا۔ ان دائیں بازو کے طاقتور سیاستدانوں نے جلد ہی ردری ۱۹۴۷ء میں ایک اور شخص کو مسلم لیگ کا وقتی (acting) سیکریٹری جنرل مقرر کردیا اور ابوالہاشم مرکزی سیاست سے دور ہو کر اپنے گاؤں بردوان (Burdwan) میں گوشہ نشین ہوگئے۔ ڈھاکہ کے نواب کا خاندان اب دوبارہ مرکز اقتدار (saddle) پر قابض ہو چکا تھا۔

اب اسٹیج تقسیم ہند کے لیے سج چکا تھا۔ مشرقی بنگال، پنجاب اور سندھ کے انتخابات سے یہ بات عیاں ہو چکی تھی کہ اسلامی نظریہ بندی نے مسلم لیگ کی کامیابی اور پاکستان کی تشکیل میں کوئی کردار ادا نہ کیا۔ کیا تقسیم کو روکا (avoid) جاسکتا تھا؟ یہ ہمارے ہندوستانی دوستوں کا پسندیدہ سوال ہے۔ لیکن اب یہ سوال بے سود ہے۔ تاریخ اپنے اُٹھائے گئے قدم واپس نہیں لیتی۔ ہمیں آگے کی طرف دیکھنا چاہیے اور اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ اب ہم کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ امن اور دوستی کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مسلمان اشراف یو پی اور بہار میں مرتکز (concentrated) تھے۔ نو آبادیاتی نظام سے قبل کی ریاست (خصوصاً ۱۸ ویں صدی) میں انہیں غلبہ حاصل تھا۔ بعد ازاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی زیر قیادت بنگال کی خوشحالی اور اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کے باعث مسلمان اشرافیہ کی بڑی تعداد نے مشرق کی طرف ہجرت کی اور یا تو مرشد آباد یا پھر ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمتیں حاصل کیں یا پھر مغربی بنگال میں سکونت حاصل کی۔ وہ اپنی زبانوں اردو اور فارسی کو بھی ساتھ لے کر چلے۔ انڈیا کے دیگر علاقوں میں مسلمان اشرافیہ کی بڑی محدود تعداد تھی سوائے حیدر آباد کے نظام کے علاقے کے۔

۲۔ منقسم (divided) خاندانی مفادات کی ایک واضح جھلک (مرحومہ) خدیجہ مستور کے انعام یافتہ ناول آنگن میں نظر آتی ہے جو کہ بعد ازاں انگریزی میں ترجمہ ہو کر لاہور سے ۲۰۰۱ء میں The Courtyard کے نام سے شائع ہوا۔

3- W Cantwell Smith, Modern Islam in India, London, 1946, pp 228-29.

۴۔ ایضاً۔

۵۔ ٹی ڈبلیو کلارک clark کے اندر ماتھ (Anandamath) کا متعلقہ ترجمہ شدہ حصہ ٹی ڈبلیو کلرک کی مرتب کردہ کتاب Historians of India, Pakistan and Ceylon, London 1961 میں موجود ہے جو کہ باب The Role of Bankin Chandra in the Development of Nationalism میں صفحہ ۲۲۴ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

۶۔ سر سید احمد خان، ہندو اور مسلمانوں میں رابطے، مقدمہ سر سید، جلد ۱۵، لاہور ۱۹۶۲ء صفحہ ۴۱۔

۷۔ ایضاً۔

8- The Indian Annual Register, 1923, Vol I, p 25.

9- C W Troll, Sayyid Ahmad Khan, OUP, Karachi and Delhi, 1979, p 18, note 75.

10- For the concept of colonial capitalism c f (1) Hamza Alavi, The Structure of Colonial Social Formationsí, Economic and Political Weekly, Vol XVI, Nos 10, 11, and 12, Annual Number, 1981, (2) Hamza Alavi, ëIndia: Transition to Colonial Capitalismí in Hamza Alavi, Doug. McEachern et al, Capitalism and Colonial Production, Croom Helm, London 1982, also published in Journal of Contemporary Asia, Vol 10, No 4, 1980.

۱۱۔ بیمل پرشاد نے ۱۹۰۶ء کے شملہ وفد کے اغراض و مقاصد اور اس کے تقسیم ہند پر اثرات کے بارے میں بڑا تفصیلی مواد فراہم کیا ہے جو کہ ان کی کتاب A Nation within a Nation کی جلد دوئم میں بیان کیا گیا ہے۔ تین جلدوں پر مشتمل یہ کتاب ڈھاکہ سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کی جلد سوئم خاص طور پر 'تحریک پاکستان' کے متعلق بڑا تفصیلی مواد فراہم کرتی ہے اور اس موضوع پر نہایت اہم اور مفید کتاب ہے بالکل اسی طرح جس طرح Francis Robinson نے قبل ازیں 'شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں علیحدگی پسندی کا رجحان' جیسی معرکتہ الآراء کتاب تحریر کی تھی جو کہ ۱۹۹۳ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔

12- Francis Robinson, op cit, p 147.

13- Cf John R MacLane, Indian Nationalism and the Early Congress, Princeton, 1977, ch 7, Congress and Landlord Interest, pp 211 ff.

14- Based on Eugene F Irschikís Politics and Social Conflict in South India, Berkeley, 1969; and M R Barnettís Politics of

Cultural Nationalism in South India, Princeton, 1976.

15- Francis Robinson, op cit, p 177.

16- Matiur Rahman, From Consultation to Confrontation, London, 1970, p 197.

17- S S Pirzada (ed), Foundations of Pakistan: All India Muslim League Documents, Vol I, 1906-1924, n d (1969?), p 258-59.

18- For the Text of the ëReform Schemeí (the Lucknow Pact), c f S S Pirzada (ed), op cit, pp 392-97.

19- See Hamza Alavi, (1) Ironies of History ó Contradictions of the Khilafat Movementí in Mushirul Hasan (ed), Islam, Communities and Nation, Manohar, New Delhi, 1998, and (2) Review Article on Pan Islam in British Indian Politicsí by Naeem Qureshií in Pakistan Perspectives, Vol 7, No 1, January-June 2002, Pakistan Studies Centre, University of Karachi.

20- M K Gandhi, Collected Works, Vol XV, Delhi, 1979, pp 63-64.

21- A M Zaidi, Evolution of Muslim Political Thought, Vol II, n d, p 122.

۲۲۔ اسی طرح ایک کوشش عبدالحمید قاضی کی طرف سے آل انڈیا مسلم لیگ کانفرنس کے ۱۹۴۳ء کے اجلاس میں کی گئی لیکن انہیں اسلامی نظریے کے متعلق قرارداد پیش کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

23- Choudhry Khaliquzzaman, Pathway to Pakistan, Lahore, 1961, p 76.

24- David Page, Prelude to Partition, OUP, Delhi, 1987, pp 114 ff.

25- A Model of this will be found in M C Pradhan, The Political System of the Jats of Northern India, OUP, Bombay, 1966; for biraderies of Punjabi Muslims c f, Hamza Alavi, The Two Biraderis: Kinship in Rural West Punjabi in T N Madan (ed), Muslim Communities of South Asia, Revised and Enlarged Edition, New Delhi, 1995.

26- Noor Ahmad, Martial Law Say Martial Law Tak (in Urdu), Lahore, 1967, pp 203-04.

27- Taj ul-Islam Hashmi provides an excellent account of conditions in

تخلیقِ پاکستان کے سماجی محرکات اور نظریہ

The Social Forces and Ideology in the Making of Pakistan

آپ میں سے بہت سوں کو محمد علی جناح کی وہ مشہور تقریر یاد ہوگی جو انہوں نے پاکستان کی نئی آئین ساز اسمبلی کا افتتاح کرتے وقت کی تھی۔ اس تقریر میں انہوں نے ملک کے لیے اس واضح سیکولر تصور کا اعادہ کیا تھا جس نے اُن کے اور دوسروں کے اندر بہت عشروں تک جدوجہد جاری رکھنے کا جوش و جذبہ اُبھارا تھا۔ انہوں نے کہا:

> ''آپ کا مذہب یا آپ کی ذات یا مسلک خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، ریاست کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہم اس بنیادی اصول سے آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب شہری ہیں اور اس ریاست کے برابر کے شہری ہیں...... ہمارے سامنے یہی مثالی نمونہ رہنا چاہیے اور آپ دیکھیں گے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نہ ہندو، ہندو رہیں گے، نہ مسلمان، مسلمان رہیں گے۔ اس کا اطلاق مذہبی لحاظ سے نہیں ہوگا کیونکہ یہ ہر شخص کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ سیاسی اعتبار سے ہوگا یعنی اس ریاست کے شہریوں کی حیثیت سے ہم سب ایک ہوں گے''۔

۱۹۵۲ء میں ہی جناح کے نالائق جانشینوں نے اس سیکولر نصب العین سے منہ موڑ لیا اور اپنی گرتی ہوئی سیاسی مقبولیت کو بحال کرنے کی خاطر مذہب کی گھسی پٹی لفاظی کا سہارا لینا شروع

کردیا۔ وہ چیخنے لگے کہ 'اسلام خطرے میں ہے' ان کا یہ نعرہ اخلاص سے عاری، بے اصل اور ایک کھوکھلا نعرہ تھا جبکہ ان کے پاس لوگوں کو دینے کے لیے حقیقت میں کچھ نہیں تھا۔ ہماری لڑکھڑاتی ہوئی قیادت نے، غلطی سے یہ سمجھ کر اسلام کا نعرہ ہر مخالف آواز کو دبانے کے لیے کافی ہوگا، یہ پُر فریب حکمت عملی اختیار کرلی۔

شروع میں وہ اسلام کے لیے زبانی ہمدردی جتانے تک خود کو محدود کیے ہوئے تھے۔ مارچ ۱۹۴۹ء میں آئین ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد (objectives resolution) منظور کی جس میں ایک شق شامل تھی کہ مسلمانوں کو ایسے مواقع فراہم کیے جائیں گے کہ وہ اپنی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں شعبوں کو قرآن پاک اور سنت کے مقرر کردہ احکامات اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھال سکیں۔ اسلامی نظریے کی بابت ابھی تک کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔ قراردادِ مقاصد پیش کرتے وقت لیاقت علی خان نے اپنی تقریر میں بالکل واضح کردیا تھا کہ یہ قرارداد محض ہمارے مذہبی رجحان کی عکاسی کرتی ہے اور یہ آئین کو کسی صورت میں اس کا پابند نہیں بناتی۔ قرارداد پیش کرتے ہوئے انہوں نے واشگاف الفاظ میں ملائیت کے نظریے کو خارج از امکان قرار دیا۔ ان کے الفاظ میں 'جناب والا! میں نے ابھی کہا کہ حقیقی طاقت عوام کو حاصل ہے۔ یہ بات، قدرتی طور پر، دینی علماء کی حکومت (theocracy) کے قیام کے کسی بھی خطرے کو ختم کردیتی ہے بنیادی اصول طے کرنے والی کمیٹی (BPC) نے ستمبر ۱۹۵۰ء میں اپنی رپورٹ میں بھی اسلامی نظریے کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اسی اصول کی پیروی کی گئی ہے۔ جی ڈبلیو چودہری (G.W.Choudhry) نے، جو ایک پکے اسلام پسند تھے کہا کہ اس قرارداد میں نئے آئین کی خصوصی اسلامی پہچان کی بابت اگر کوئی شق ہے بھی تو اس کی نوعیت بہت معمولی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ علماء (مذہبی) اس بات پر بہت ناراض ہیں۔

بہرصورت، اس سے پہلے کہ BPC اپنی حتمی رپورٹ تیار کرنے کے لیے مزید اقدامات کرتی ایک بڑا واقعہ رونما ہوگیا جس نے پاکستان کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ ۲۱ فروری ۱۹۵۲ء کو بنگالی زبان کی اہم تحریک بیک وقت سارے مشرقی بنگال میں نہایت شدت کے ساتھ پھوٹ پڑی۔ کئی دنوں تک سارا بنگال زبان کی تحریک کے قبضے میں رہا۔ اس کی قیادت اپنی تحریک کی ناقابل یقین کامیابی سے حیرت زدہ ہوکر رہ گئی۔ لیکن اس تحریک کو مزید آگے بڑھانے کے لیے

ان کی تیاری مکمل نہیں تھی لہذا چند دنوں میں اس کا زور ٹوٹ گیا مگر ایک بڑے توانا چیلنج کی حیثیت سے یہ تحریک زندہ رہی۔ بنگالی مطالبات تسلیم کرنے کی کوئی راہ نکالنے کے بجائے پاکستان کے حکمراں طبقے نے، بہت ہی احمقانہ انداز میں، یہ سوچا کہ مذہبی نعرے بلند کر کے وہ بنگالی قوم پرستوں کو الگ تھلگ رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اسلامی نظریہ اور 'اسلامی' شناخت کے نعروں کا استعمال بنگالیوں کے غم و غصے کا توڑ کرنے کے لیے شروع کیا گیا۔ بنگال کی بے اطمینانی کے 'بنیادی' اسباب پر غور کرنے کے بجائے انہوں نے ایک یہ دلیل پیش کی ہم سب 'مسلمان اور پاکستانی ہیں' اور اس لیے بنگالی یا سندھی یا بلوچی یا پٹھان نہیں ہو سکتے۔ نسلی امتیاز کی اس نئی تعریف کا صحیح معنی میں مذہبی اقدار سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ یہ ایک کھوکھلی سیاسی دلیل تھی جس کے نتیجے میں صرف تباہی ہمارا مقدر بنی۔

چنانچہ بنگالی تحریک کے جواب میں BPC کی اس حتمی رپورٹ میں جو ۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو پیش کی گئی اسلامی نظریے کی ایک بڑی خوراک (dose) موجود تھی G.W.Choudhary خوشی کے مارے اچھل پڑے اور انہوں نے تحریر کیا' آئین کا یہ دوسرا مسودہ (BPC کی اس حتمی رپورٹ کو انہوں نے یہی نام دیا تھا) مجوزہ آئین میں خصوصی اسلامی پہچان سے متعلق شقیں شامل کرنے کے لحاظ سے امتیازی حیثیت کا حامل ہے'۔ لیاقت اور ان کے ساتھیوں نے جب یہ دیکھا کہ انہیں علاقائی تحریکوں سے نمٹنے اور اپنی پارٹی کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانے کا چیلنج درپیش ہے تو وہ پہلے سے بھی زیادہ زوردار آواز میں چیخنے لگے کہ 'اسلام خطرے میں ہے۔

تقسیم کے تقریباً پانچ سال بعد، ہمارے دوسرے درجے کے حکمرانوں نے اسلامی نظریے کو اپنا لیا جن کے پاس عوام کو دینے کے لیے حقیقت میں کچھ نہیں تھا۔ مخالف سمت میں پالیسی کی اس تبدیلی کو زیادہ قابل اعتبار بنانے کی خاطر انہوں نے نئے دریافت شدہ اسلامی نظریے کو ایک ادارے کی شکل دینے کا فیصلہ کیا۔ تعلیمات اسلامیہ کا ایک بورڈ تشکیل دیا گیا اور بڑے مذہبی علماء کو اس میں ملازمتیں فراہم کی گیں جنہیں لیاقت پہلے ہی اس بات پر آمادہ کر چکے تھے کہ پاکستان آ کر وہ اپنی تقدیر بنائیں کیونکہ یہاں ان کے لیے بہترین مواقع موجود ہیں۔ اس بورڈ کے پاس حقیقی اختیارات نہیں تھے۔ پاکستان کی حکمراں بیوروکریسی، ملاؤں کے ساتھ شراکت اقتدار کے لیے تیار نہیں تھی۔ چنانچہ بورڈ کا کام حکومت کو محض مشورہ دینا تھا اور وہ بھی صرف ان معاملات پر

جن کے لیے اس سے رجوع کیا جائے۔ حکومت، بورڈ کی سفارشات ماننے کی پابند نہیں تھی۔ جب بھی یہ بورڈ اپنی تجاویز پیش کرتا تھا، انہیں سرسری طور پر رد کر دیا جاتا تھا۔ لیکن یہ بڑے علماء پھر بھی خوش وخرم نظر آتے تھے کیونکہ معقول تنخواہیں ملنے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں انہیں ایک باعزت مقام بھی حاصل تھا۔ مولانا مودودی جیسے سرکش علماء کا نصیب قید خانہ تھا۔ اسلامی نظریئے کے حوالے سے ایسی رعایتیں دینے کا سلسلہ تمام حکومتوں کے زمانے میں مسلسل جاری رہا یہاں تک کہ بھٹو کی احمقانہ قسم کی عوامی پالیسیوں کی بدولت مولوی صاحبان دوبارہ سرگرم ہو گئے۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ یہی لوگ بالآخر ان کے زوال کا سبب بن گئے۔ ضیاء نے آ کر، بلا کسی جواز کے فیصلہ کیا کہ جہاں تک ان کی اپنی ذات کا تعلق ہے وہ اسلام کے نام سے بھرپور فائدہ اٹھائیں گے۔ متعدد عشرے گزر جانے کے بعد ابھی تک ہم ان کے ورثے کے نتائج بھگت رہے ہیں جس کے اثرات زائل کرنے میں ان کے بعد آنے والی منتخب حکومتیں بھی ناکام ہو چکی ہیں۔ ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں بنیاد پرست مذہبی پارٹیوں کی غیر متوقع کامیابیاں اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ہم انہیں خوش رکھنے کی پالیسی کے ناگزیر اثرات کی فصل کاٹ رہے ہیں۔

پاکستان کے نظریئے کے بارے میں جناح کے واضح پالیسی بیان کو ان کے جانشینوں نے بے تامل رد کر کے بعد از وقت اس کی نئی وضاحتیں شروع کر دیں۔ ۱۹۶۹ء میں جنرل جانشینوں نے بے تامل رد کر کے بعد از وقت اس کی نئی وضاحتیں شروع کر دیں۔ ۱۹۶۹ء میں جنرل یحیٰ خان کے وزیر، جنرل شیر علی نے اعلان کر دیا کہ اسلامی نظریہ ہی نظریہ پاکستان قرار پائے گا۔ یہ حل (solution) نکال کر اس کا سلسلہ ماضی سے جوڑ دیا گیا اور تب سے مورخوں نے (پاکستان کے اندر اور بیرون ملک بھی) اس بے حقیقت دعوے کو درست قرار دینے کی ذمہ داری سنبھال رکھی ہے۔ درسی کتب از سر نو لکھوائی گئیں۔ پچاسوں جھوٹ بول کر ہمیں اپنے ماضی سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا۔ ایک سیکولر ذہن رکھنے والوں نے بھی حیرت زدہ ہو کر کہنا شروع کر دیا کہ آخر کار کہیں یہ مذہب ہی تو نہیں تھا جو حقیقت میں تخلیق پاکستان کا سبب بنا۔ ان میں سے کچھ یہ فرض کرتے ہیں کہ اس کے لیے ایک عوامی تحریک کا ہونا لازمی ہے۔ کسی عوامی تحریک کی کامیاب شروعات کس طرح کی جا سکتی ہے اگر اس کو متحرک رکھنے کے لیے کوئی طاقتور مذہبی نظریہ موجود نہ ہو۔ ان کا سوال ہے کہ اس کے علاوہ اس کی دوسری کون سی توضیح کی جا سکتی ہے۔ یہ سب کچھ ایک مفروضہ ہے۔ کسی

نے ابھی تک ان سماجی محرکات کا گہری نظر سے جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی جو فی الحقیقت پاکستان کی تخلیق کے ذمہ دار تھے۔ ہمارا حقیقی ماضی ہم سے چھین لیا گیا ہے اور یہ اس جگہ دفن ہے جہاں اسے پانا ممکن نہیں۔ ہمیں اس کی کھوج لگانا پڑے گی۔ تو پھر آیئے! اس پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

II

جدید مسلم سیاست کی ابتداء شمالی ہند کے مسلم اقلیتی صوبوں میں ہوئی جن میں یو پی اور بنگال خاص طور پر نمایاں تھے۔ مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں کے اندر، جن پر موجودہ پاکستان مشتمل ہے یعنی کہ پنجاب، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد کے مسلمان نسبتاً پسماندہ تھے اور شہری آبادی پر غیر مسلموں کا غلبہ تھا۔ ترقی یافتہ طبقے جو جدید ہندوستانی مسلمان سیاست کے محرک تھے ان علاقوں میں موجود نہیں تھے۔

انیسویں صدی میں انگریزوں نے نئی اینگلو ورنا کیولر پالیسی (انگریزی اور مقامی زبانوں پر مشتمل) متعارف کرائی جس کی بدولت جدید ہندوستانی مسلم سیاست کا آغاز شمالی ہند میں ہوا۔ سرکاری زبان کے طور پر فارسی کا استعمال ختم کر دیا گیا۔ فارسی شمالی ہند کے مسلم اشراف یعنی سابق حکمراں طبقہ اشرافیہ کی زباں تھی۔ فارسی کی سرکاری زبان ختم ہو جانے سے اس طبقے کو زبردست نقصان پہنچا۔ سرکاری ملازمتوں کا اہل ہونے کے لیے انگریزی تعلیم حاصل کرنا لازمی تھا۔ ہندو ملازمت پیشہ ذاتوں کے لوگ جیسے کائستھوں، کھتریوں اور کشمیری برہمنوں نے زیادہ تیزی کے ساتھ انگریزی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی اور وہ سرکاری ملازمتوں کے مقابلوں میں زیادہ کامیابی حاصل کرنے لگے جن پر پہلے مسلم اشراف کا اجارہ تھا۔ یوں مسلمانوں کی برتری ختم ہونے لگی۔

سامراجی حکومت کے اثرات کے لحاظ سے مسلم اشراف کو تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس اثر پذیری کی نوعیت مختلف تھی۔ پہلے وہ زمیندار تھے جو سیاسی طور پر انگیزوں کے ساتھ تھے جس کے لیے انہیں بہت زیادہ نوازا گیا۔ ایک طبقے کی حیثیت سے وہ برطانوی سامراج کے سب سے زیادہ وفادار تھے۔ اگرچہ اس میں چند مستثنیات تھیں مثلاً محمود آباد کے راجا (باپ اور بیٹے) جو مسلم لیگ کے سرگرم رکن تھے۔ مسلم اشراف کے دوسرے گروپ میں علماء تھے

جن کو نئی زبان پالیسی سے سب سے زیادہ نقصان پہنچا تھا۔ وہ ان بچوں سے محروم ہو گئے جو فارسی اورعربی پڑھنے کے لیے ان کے مدرسوں میں آیا کرتے تھے کیونکہ اب انہیں انگریزی اسکولوں میں پڑھنے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ انگریزی میں تحریر شدہ نئے قواعد وضوابط کے استعمال کی وجہ سے علماء سے وہ قانونی کردار بھی چھن گیا جو وہ مخصوص مقدمات میں قانون شریعت کے اطلاق کے سلسلے میں، یا متنازعہ معاملات کے ضمن میں فتوے صادر کرنے میں یا تنازعات میں ثالث کے فرائض انجام دینے میں ادا کیا کرتے تھے۔ اس کے جواب میں پہلے انہوں نے انگریزوں (اور سکھوں) کے خلاف جنگی مہمات شروع کیں اور ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت (national revolt) میں نمایاں کردار ادا کیا مگر انہیں سختی سے کچل دیا گیا۔ بغاوت کے فرو ہونے کے بعد علماء نے اپنے مدرسوں میں پناہ ڈھونڈی مثلاً نیا قائم شدہ دارالعلوم دیوبند یا پرانے فرنگی محل کا مدرسہ وغیرہ۔ ایک طبقے کی حیثیت سے وہ دوبارہ سیاسی اکھاڑے میں نہیں اُترے جب تک انہیں ۱۹۱۸ء میں تحریک خلافت میں شامل ہونے کا موقع ہاتھ نہیں آیا۔

بہرصورت، سب سے اہم اشراف گروپ، جو جدید ہندوستانی مسلم سیاست کا محرک تھا، ان تعلیم یافتہ اشراف گروپ پر مشتمل تھا جو خاص طور پر سرکاری ملازمتوں میں اپنا مستقبل سنوارنے پر انحصار کرتے تھے۔ میں نے انہیں (the salariat) یعنی تنخواہ دار طبقے کا نام دیا ہے جو تنخواہ دار ملازم کی حیثیت سے اپنا مستقبل (career) بنانے کے خواہش مند ہوتے ہیں اور اسی پر انحصار کرتے ہیں۔ ایک بڑے نجی سیکٹر کی عدم موجودگی میں سرکاری ملازمت کے حصول پر بے انتہا انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ان ہی کے ساتھ پیشہ ور حضرات (professionals) جیسے وکلاء اور ڈاکٹر صاحبان تھے ان کے لیے بھی نئی زبان پالیسی کا مطلب یہی تھا کہ لازمی طور پر انگریزی زبان سیکھیں۔ مسلم تنخواہ دار طبقے اور پیشہ ور حضرات کا مقابلہ ہندوؤں سے تھا جو ایسی ہی سرکاری ملازمتوں کے خواہش مند تھے یا بطور پیشہ ور (professionals) اپنا کیریئر بنانا چاہتے تھے۔ بدقسمتی سے، ہندوستانی سماج کی ذات، پات پر مبنی ساخت کو دیکھتے ہوئے تنخواہ دار اور پیشہ ور ہندو اور مسلمان ممبران (لوگ) ایک دوسرے سے مقابلے کے لیے مستعد رہتے تھے کیونکہ ان کی ملاقاتیں اور زندگیاں، حریف منظم فرقوں (institutional communities) کے بیچ میں گھری ہوئی تھیں۔ مسلم اور ہندو تنخواہ داروں کے درمیان باہمی مقابلے سے مسلمان اور ہندوؤں

کی غالب اکثریت کو براہ راست کوئی تشویش نہیں تھی۔ مسلم اشراف خود اپنے مستقبل کے لیے فکر مند رہتے تھے اور انہیں غریب مسلمانوں اور ان کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مثال کے طور پر، انسیویں صدی میں، درآمد شدہ اور ہندوستانی ملوں میں بنے ہوئے دونوں قسم کے کپڑے سے مسابقت کے باعث، مسلمان جولاہے شدید بحران سے گزر رہے تھے۔ مسلم اشراف ان غریب اور پریشان حال جولاہوں کے مسائل سے بالکل لاتعلق تھے۔ تنخواہ دار طبقے اور پیشہ ور حضرات اپنے مخصوص مفادات کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ انہی نچلے متوسط طبقے کے مسلمان اور ہندو گروپوں کے درمیان مسابقت کی دوڑ نے آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کی پالیسیوں کی بالترتیب صورت گری کی۔ اپنے محدود طبقاتی مطالبات کا جواز مہیا کرنے کے لیے انہوں نے ہندوستانی قوم پرستی اور مسلم قوم پرستی کے تصورات کا استعمال کیا۔

کہا جاتا ہے کہ مسلم اشراف پسماندہ تھے۔ یہ خیال ولیم ہنٹر کی کتاب On Indian Musalmans سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مشرقی بنگال کے معلومہ مواد (data) کی بنیاد پر لکھی گئی ہے جہاں مسلمان واقعی غیر مراعات یافتہ تھے مگر شمالی ہند کے مسلمان بے حد مراعات یافتہ تھے۔ یو پی میں مسلمان کل آبادی کا ۱۲ فیصد تھے جو ایک چھوٹی اقلیت تھی۔ اس کے باوجود ۱۸۵۷ء میں یو پی میں ماتحت عدالتی اور انتظامی سروسز (services) کے عہدوں پر فائز مسلم اشراف کی تعداد ۶۴ فیصد سے کم نہیں تھی (اس سے بالاتر عہدے سفید فام افراد کے لیے مختص تھے) بہر نوع، بہت زیادہ مراعات یافتہ مسلم اشراف کی تعداد میں تیزی سے کمی آرہی تھی۔ ۱۸۸۶ء تک ان کے پاس صرف ۴۵ فیصد عہدے باقی رہ گئے تھے، اگرچہ ۱۲ فیصد مسلم آبادی کے تناسب سے وہ اب بھی بہت مراعات یافتہ تھے۔ یہ اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی سبقت (lead) کم ہوتی جارہی تھی۔ لہٰذا سرسید نے تجویز پیش کی کہ دونوں فرقوں (communities) کے لیے سرکاری ملازمتوں میں مساوی کوٹا (a 50-50 quota) مقرر ہونا چاہیے۔ چنانچہ، جدید ہندوستانی مسلم سیاست کی بنیاد کوٹے (quota) پر مبنی سیاست تھی اور ایک مذہبی تحریک نہیں تھی۔ تعلیم آئندہ خوش حالی کی کنجی تھی۔ علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی جانب راغب کیا۔ سرسید کی تقلید میں انگریزی کی تدریس کے لیے سارے ملک کے اندر مسلم ایجوکیشنل سوسائٹیز قائم ہونا شروع ہو گئیں۔

اس طرح، ایک نئے اینگلو ورنا کیولر کلچر کا، جو سائنس اور عقلیت کی جانب نسبتاً زیادہ مائل تھا، ارتقائی عمل شروع ہوا جس کا اظہار اکثر مخصوص ہندوستانی مفہوم میں کیا جاتا تھا۔ یہ مسلم اشراف کے تنخواہ دار طبقے اور پیشہ ور گروپس (professional groups) کا کلچر تھا۔ غریبوں تک اس کی رسائی نہیں تھی، خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم ہوں۔ غریب مسلمانوں کے کلچر پر مولوی صاحبان حاوی تھے۔ سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی جانب راغب کرنے اور ان کے اندر عقلی اور سائنسی طرز فکر پیدا کرنے کی داغ بیل ڈالی۔ البتہ انہیں صرف مسلم اشراف کے مستقبل سے دلچسپی تھی۔ تمام مسلمانوں، بشمول غریب مسلمانوں کے مستقبل سے نہیں۔ یہ بات بڑے پیمانے پر محسوس نہیں کی جاتی۔ وہ چھوٹی ذات کے لوگوں کو رئیسانہ حقارت سے دیکھتے تھے۔ وائسرائے کی قانون ساز کونسل کی ممبر شپ (membership) کی مطلوبہ اہلیت پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنے گہرے طبقاتی تعصب (ذاتوں کا امتیاز) کا اظہار کیا جب انہوں نے کہا کہ یہ بات اشد ضروری ہے کہ وائسرائے کی کونسل میں اعلیٰ سماجی رتبے کے حامل افراد کو شامل کیا جائے۔ کیا ہمارا طبقہ اشرافیہ اس بات کو پسند کرے گا کہ ان کے سروں کے اوپر، ایک چھوٹی ذات والے یا کم اصل شخص کو، خواہ وہ بی اے یا ایم اے ہی کیوں نہ ہوں اور مطلوبہ اہلیت بھی رکھتا ہو، ایک با اختیار اعلیٰ عہدے پر بٹھا دیا جائے۔ اور اسے وہ قوانین بنانے کا اختیار حاصل ہو جائے جو ان کی زندگیوں اور جائیدادوں پر اثر انداز ہوتے ہوں۔

مسلم تنخواہ دار طبقے اور پیشہ ور حضرات کی جانب سے سیاسی سرگرمی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۰۶ء سے ہوا جب مسلم زعماء کے ایک وفد نے وائسرائے لارڈ منٹو سے مل کر ان سے یہ درخواست کی کہ انگریزی تعلیم یافتہ مسلم اشراف کے حقوق کے لیے قانون ساز ادارے کے ممبروں پر دباؤ ڈالا جائے۔ جب نواب محسن الملک کو، جو اس وقت علی گڑھ کے تعلیمی ادارے کے سربراہ تھے، معلوم ہوا کہ سیکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا لارڈ مارلے (Morley) ہندوستان میں آئینی اصلاحات کی تجاویز یا منصوبوں کے اعلان کے لیے تقریر کرنے والے ہیں تو انہوں نے فوراً مسلم زعما کے ایک وفد کا انتظام کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں تا کہ یہ وفد تعلیم یافتہ مسلم اشراف کے مطالبات پر مبنی اپنی تجاویز وائسرائے کے سامنے پیش کر سکے۔ فرانسس رابن سن اس ملاقات کا مختصر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لارڈ مارلے نے ان سے ہمدردی ظاہر کرنے کے سوا کوئی وعدہ نہیں کیا۔
ہندوستانی قوم پرستوں اور کیمونسٹ مورخین نے اس ملاقات کی اہمیت کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ مولانا محمد علی کے الفاظ میں 'یہ وائسرائے کے ایما پر کھیلے جانے والا ایک فرمائشی ناٹک تھا جو ان کی تقسیم کرو اور حکومت کرو' (divide and rule) کی پالیسی کا حصہ تھا۔
اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اس الزام میں کوئی صداقت نہیں تھی۔ منجملہ دوسرے مورخین کے، ایک ہندوستانی مورخ بمل پرشاد نے حال ہی میں اس کہانی کی تفصیلات ظاہر کی ہیں اور ثابت کیا ہے کہ یہ قطعاً جھوٹا الزام ہے۔ اس ملاقات کی پہل کلی طور پر نواب محسن الملک کی جانب سے ہوئی تھی۔''

اسی سال کے آخر میں، دسمبر ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گئی جب نواب سلیم اللہ کی دعوت پر مسلم رہنماؤں کا اجلاس ڈھاکہ کے مقام پر ہوا لیکن یوپی کے اشراف نے، علی گڑھ کے نواب وقار الملک کی سربراہی میں، تمام بڑے عہدے اور ورکنگ کمیٹی کے ممبران کی اکثریت حاصل کر کے اس نئی تنظیم کو زبردستی اپنے قبضے میں لے لیا۔ لیگ نے مغربی تعلیم یافتہ مسلم پیشہ ور حضرات اور تنخواہ دار طبقے کے پیش کردہ مطالبات تسلیم کر لیے۔ اسلامی نظریے کو مسلم لیگ کے ایجنڈے میں شامل کرنے کی کوششیں بہت کم کی گئیں اور یہ ہمیشہ ناکام رہیں۔ مسلم لیگ کے نظریے میں اسلامی نظریئے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ سو، یہ بات باعث حیرت نہیں ہے کہ مولوی صاحبان شروع دن سے مسلم لیگ کے کٹر مخالف تھے۔

مدلل انداز میں، اسلامی نظریہ اختیار کرنے کی سب سے پہلی کوشش مولانا شبلی نعمانی نے کی جو دینی اقدار کے پکے حامی تھے۔ انہوں نے تجویز کیا کہ علی گڑھ کے نصاب (sylabus) کو اسلامی رنگ میں ڈھالا جائے۔ شبلی چاہتے تھے کہ انگریزی اور جدید سائنسی علوم کی جگہ اس تعلیمی ادارے کے لیے اسلامی علوم اور عربی زبان پر مبنی نصاب وضع کیا جائے۔ مسلم پیشہ ور حضرات اور تنخواہ دار طبقے کے لوگوں کی جانب سے اس کوشش کے ردعمل کو جاننے کے لیے ایک وکیل، رضا علی کے نقطہ نظر کو مثال بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے جو علی گڑھ کے تعلیمی مرکز میں سرسید کے جانشین

محسن الملک اور وقار الملک کے ایک بہت قریبی اور با اثر معاون تھے۔ رضا علی نے انگریزی اخبار (The Statesman) میں اپنے ایک آرٹیکل میں اس تجویز پر نہایت سخت الفاظ میں تنقید کی جس کا اقتباس انہوں نے اپنی خودنوشت (autobiography) میں شامل کیا ہے۔

رضا علی نے لکھا کہ کبھی کبھار عقل اور جذبات میں باہم کشمکش شروع ہو جاتی ہے لیکن عقل اور جذبات کی یہ کشمکش جو شبلی کی تجویز کی اساس ہے، کسی بھی دوسرے مسئلے کے ضمن میں کسی ایسی کشمکش کے مقابلے میں معمول سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے۔ قرطبہ اور بغداد کے کارناموں کی یاد مسلمانوں کے دلوں کو اتنا ہی لبھاتی ہے جتنا کہ ایک ضعیف الاعتقاد عورت کے دل کو اس کا تعویذ جسے وہ ہمیشہ اپنے سینے سے لگا کر رکھتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کے ان جذبات سے ہمدردی نہ رکھنا، بے حد مشکل کام ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس حقیقت سے انکار کرنا، جو صاف ظاہر اور آشکار ہے، ایک احمقانہ بات ہوگی۔ یہ تجویز جو اس وقت ہمارے سامنے ہے (یعنی عربی تعلیم جو شبلی نے تجویز کی ہے) سطحی طور پر نہایت پرکشش نظر آتی ہے۔ بہرحال، ہمیں حقیقت سے آنکھیں چرانا نہیں چاہیے...... ہمارے سامنے سوال یہ ہے: ہماری کمیونٹی کس قسم کی تعلیم چاہتی ہے اور کس قسم کی تعلیم کی اُسے ضرورت ہے؟ میری نظر میں، ہمیں اس قسم کی تعلیم کی بہت زیادہ ضرورت ہے جو دنیا کے معاملات سے نمٹنے میں ہماری مدد کرنے میں سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہو...... جو آئندہ نسلوں کو روزگار مہیا کرنے میں ممد و معاون ہو۔ یہی مسلم لیگ کے نظریئے کی اصل حقیقت تھی۔

رضا علی نے متنبہ کیا کہ ابتدائی اسلام کی جانب قیاسی رجعت (hypothetical return) اور ایک اسلامی ریاست کی تخلیق، جو مُلّاؤں کے زیر نگیں ہو، ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی سب سے مقدم فوری ضرورت یہ ہے کہ انہیں ایسی تعلیم مہیا کی جائے جو دنیا کے معاملات سے نمٹنے میں ان کی مددگار ثابت ہو، ایسی تعلیم جو ان کی آئندہ نسلوں کو روزگار مہیا کرنے میں ان کی ممد و معاون ہو۔ مسلم تنخواہ دار اور پیشہ ور طبقوں کے مفادات کو واضح طور پر دہراتے ہوئے انہوں نے گویا مسلم قوم پرستی کے سیکولر نظریئے کا اعادہ کیا۔ شبلی کو علی گڑھ چھوڑنا پڑا کیونکہ یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں ان کے دینی افکار پنپ سکتے۔

جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے، جیسے جیسے اس کی حمایت میں اضافہ ہوتا گیا، ویسے ویسے اس کی طبقاتی حمایت کی بنیاد میں متوازی تبدیلی واقع ہونے لگی۔ ان میں بڑے زمیندار خاندانوں

کے لوگ ابھی تک بہت ہی کم تھے۔ فرانسس رابن سن کے مطابق، ان کی بڑی اکثریت اس طبقے سے تعلق رکھتی تھی جن کو زمین کا تھوڑا بہت لگان مل جاتا تھا لیکن عمومی طور پر زندہ رہنے کے لیے انہیں ملازمت ڈھونڈنی پڑتی تھی یا کسی پیشے سے وابستہ ہونا پڑتا تھا۔ یہ مسلم اشراف کا کم مراعات یافتہ طبقہ تھا۔ انہی لوگوں پر مشتمل طبقہ مسلم لیگ کی حمایت کی مستقل بنیاد بن گیا، اگرچہ مالدار خاندانوں کے تنخواہ دار افراد، چند جاگیردار جیسے راجا آف محمود آباد، والد (انہیں اسی قدر سرگرم ان کے بیٹے، امیر احمد خان سے خلط ملط نہ کیا جائے) اور چند تاجر پیشہ ور حضرات اس تحریک میں حصہ لیتے رہے۔

III

حمایت کی بنیاد کی ان طبقاتی تبدیلیوں کے ساتھ مسلم لیگ کی طاقت کا مرکز علی گڑھ کے قدامت پرستوں سے ہٹ کر نسبتاً ایک زیادہ انقلابی قیادت کے پاس کھنچ کر لکھنؤ پہنچ گیا اور مسلم لیگ کا دفتر بھی بدل کر یہیں آ گیا۔ ۱۹۱۲ء میں ایک توانا اور انقلابی شخصیت، وزیر حسن نے سیکریٹری جنرل کا عہدہ سنبھال لیا۔ اب مسلم لیگ کے سیاسی انداز اور کانگریس کے ساتھ اس کے طرزِ عمل کے لحاظ سے ایک نیا دور شروع ہوا۔ مسلم لیگ کے اندر یہ احساس بڑھنے لگا کہ کانگریس کے ساتھ ایک متحدہ محاذ بنائے بغیر وہ برطانوی سامراجی حکومت کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائیں جس کے نتیجے میں ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر زور دیا جانے لگا۔

مسلم لیگ کو کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو لیگ اور کانگریس کے درمیان پل کا کام انجام دے سکے۔ جناح ایک واضح انتخاب تھے۔ انہیں انڈین نیشنل کانگریس میں ایک اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ وہ ان دو تحریکوں کو قریب لانے کی بہترین پوزیشن میں تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۳ء میں جب وزیر حسن اور مولانا محمد علی سیکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا سے ملنے کی خاطر لندن میں موجود تھے (جنہوں نے اندریں صورت، ان سے ملنے سے انکار کر دیا تھا) تو انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جناح سے ملاقات کی۔ دونوں نے انہیں مسلم لیگ میں شامل ہونے اور کانگریس لیگ اتحاد کے لیے کام کرنے پر آمادہ کیا۔ جناح اس شرط پر راضی ہوئے کہ ان کے کانگریس کے ساتھ کیے ہوئے عہد برقرار رہیں گے۔

جناح نے کانگریس۔ لیگ اتحاد کے لیے سخت محنت کی جس کی تصدیق ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور لیگ کے مشترکہ اجلاس میں میثاق لکھنو کی منظوری سے ہوتی ہے۔ اس معاہدے کے تحت، کانگریس نے لیگ کے چند مطالبات منظور کر لیے جن میں جداگانہ انتخابات کا ان کا بنیادی مطالبہ شامل تھا۔ مسلمانوں کے اس مطالبے کی گوکھلے نے پُرزور حمایت کی لیکن یہ مطالبہ بہت متنازعہ تھا۔ مسلم اقلیتی صوبوں جیسے یو پی کو Morley-Minto اصلاحات میں فراہم کردہ سیٹوں کے مقابلے میں زیادہ بڑا حصہ دیا گیا۔ اس سے مسلم اکثریتی صوبوں کی حق تلفی ہوئی۔ ۵۲ فیصد آبادی رکھنے والے مسلم اکثریتی صوبے بنگال کو سیٹوں میں صرف ۴۰ فیصد حصہ دیا گیا۔ پنجاب جس کی ۵۵ فیصد آبادی مسلمان تھی، اس کا سیٹوں میں حصہ صرف ۵۰ فیصد تھا۔ اس کے برعکس یو پی کو جس میں مسلم آبادی صرف ۱۲ فیصد تھی، سیٹوں میں ۳۰ فیصد حصہ دیا گیا۔ ایسا کیوں نہ ہوتا، آخر یو پی کا ممتاز طبقہ اشرافیہ ہی اس سارے کام میں پیش پیش تھا۔ یہ معاملہ میثاق لکھنو کا سب سے زیادہ متنازعہ فیہ پہلو ثابت ہوا۔ کانگریس نے مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات کے مطالبے کو منظور کر کے اپنا فرض ادا کر دیا تھا مگر انہیں یقین تھا کہ جائیداد کی اہلیت کے معیار پر پورا نہ اترنے کی وجہ سے مسلمان اپنے اکثریتی انتخابی حلقوں سے بھی منتخب نہ ہو سکیں گے۔ بعدازاں، بہرصورت، یہ صورت حال نئی نسل کے کانگریسی لیڈروں کے لیے بھی پریشان کن ہوگئی۔

میثاق لکھنو کی جائز تنقید کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم اس کی اہمیت کو نظرانداز کر دیں۔ یہ معاہدہ کانگریس اور مسلم لیگ کو یکجا کر کے ایک مشترکہ پلیٹ فارم مہیا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا تاکہ برطانوی سامراج کے خلاف مل کر جدوجہد کی جا سکے۔ یہ مسلم لیگ اور جناح ہی تھے جنہوں نے اس اتحاد کے لیے پہل کی تھی اور کانگریس نے اس کا مثبت جواب دیا تھا۔ جناح اتحاد کے نقیب تھے، نہ کہ علیحدگی پسند، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ وہ رکاوٹوں کے باوجود پچیس برس تک یہ مشکل کردار نبھاتے رہے یہاں تک کہ ان کی تمام تر کوششوں کے باوصف، ایک ایسا مقام آ گیا کہ اتحاد کی کوئی صورت (option) باقی نہیں رہی۔

میثاق لکھنو صرف مسلم مطالبات سے متعلق نہیں تھا۔ اس میں سامراجی حکومت کے سامنے کانگریس اور لیگ کے مشترک مطالبات رکھے گئے تھے جن کو منوانے کے لیے سامراجی حکومت کے روبرو کھڑے ہو کر دونوں کو باہم مل کر جدوجہد کرنا تھی۔ چنانچہ، مثال کے طور پر، معاہدے میں

مطالبہ کیا گیا تھا کہ قانون ساز اسمبلیوں کے اندر منتخب ممبران، اکثریت میں ہوں گے۔ اس میں یہ مطالبہ شامل تھا کہ صوبوں میں ۸۰ فیصد منتخب ممبران کی ہوگی اور صرف ۲۰ فیصد ممبران نامزد کیے جائیں گے، اور یہ کہ کونسل کے ممبران کو عوام براہ راست منتخب کریں گے اور یہ انتخاب جہاں تک ممکن ہو، وسیع بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے عمومی رائے کے برعکس، یہ معاہدہ محض مسلمانوں کو رعایتیں دینے سے متعلق نہیں تھا۔ اس معاہدے میں ان خاص اصول کا بھی اعادہ کیا گیا تھا جس کی بنیاد پر کانگریس اور مسلم لیگ قریبی اتحادیوں کی طرح مل کر سامراجی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کو آگے بڑھائیں گے۔ میثاق لکھنو کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے جتنی عام طور پر فرض کی جاتی ہے۔

قبل اس کے کہ میثاق لکھنو کی سیاست کے اثرات رونما ہوتے، تحریک خلافت (۱۹۲۴ء۔۱۹۱۸ء) نے اس معاہدے کو ناکام کر دیا جس میں اہم کردار مولوی صاحبان کا تھا۔ اس سے پہلے ہندوستانی مسلم سیاست کے اندر مذہبی نظریئے کا وجود نہیں تھا۔ تحریک خلافت میں مذہب توجہ کا مرکز بن گیا جس کے باعث مسلم لیگی قیادت تبدیل ہوگئی۔ جناح اور وزیر حسن جیسی سیکولر شخصیات کو مسلم لیگ سے باہر نکال کر مولانا شوکت علی جیسے دوسرے درجے کے رہنما، صف اول کے لیڈر بن گئے۔ بہرحال، تحریک خلافت کے حقیقی لیڈر مہاتما گاندھی تھے۔ ان کے اپنے الفاظ میں وہ اس تحریک کے ڈکٹیٹر (dictator) بن گئے تھے۔ مولانا عبدالباری آف فرنگی محل جیسے انتہا پسند مولوی صاحبان ان کے ساتھ ساتھ تھے لیکن ہر مرحلے پر انہی کے مشورے پر عمل کرتے تھے۔ گاندھی کی زیر قیادت خلافت کی تحریک ایک طاقتور عوامی تحریک بن گئی تھی لیکن خود اپنے داخلی تضادات کے باعث جلد ہی ناکام ہوگئی۔ گاندھی کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے تحریک خلافت کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کا فرض ادا کیا۔ لیکن میثاق لکھنو کے برعکس، تحریک خلافت کی وجہ سے ۱۹۲۰ء کے عشرے میں خوفناک قسم کے فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوگئے۔ میثاق لکھنو جس نے مسلم لیگ اور کانگریس کو متحد کرنے کا جو فریضہ سرانجام دیا تھا، وہ کہیں راستے میں گم ہوگیا۔

یہ بالکل درست ہے کہ مسلم لیگ محض ایک چھوٹے سے ممتاز مسلم طبقے کی نمائندگی کرتی تھی۔ مسلم عوام، مزدور اور کسان بڑی حد تک اس کی توجہ سے محروم تھے۔ مولوی صاحبان، جو

تحریک خلافت کے کرتا دھرتا تھے، مسلمانوں کے کسان اور مزدور کسی بھی طبقے کے مطالبات کے لیے آواز نہیں اٹھاتے تھے۔ ان کے طور، طریقے، اونچی سطح پر طبقہ امراء کے ساتھ معاملات طے کرنے تک محدود رہتے تھے۔ مولوی صاحبان متوسط طبقے کے روایت پسند بورژوا (petty bourgeois) تھے جو مستقبل کے بجائے مردہ ماضی (the dead past) کے ترجمان تھے۔ مستقبل کا وہ رخ جس کی جانب مسلمانوں کو دیگر اہل ہند کے ہمراہ چلنے کی ضرورت تھی، ان کی نظروں سے اوجھل تھا۔ تحریک خلافت کا خاص نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم لیگ کو بہت زیادہ نقصان پہنچا جس کا ازالہ ایک عشرے سے زیادہ عرصے تک نہ ہو سکا۔ عام مزدور طبقوں میں اپنا کوئی اثر نہ رکھنے کی وجہ سے اس زمانے میں مسلم لیگ کا وجود محض برائے نام تھا۔ خلافت پرستوں کے سامنے اس کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی تھی۔

مصطفےٰ کمال کی سربراہی میں ترک جمہوری قوم پرستوں کے ہاتھوں خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد، تحریک خلافت اپنی عوامی حمایت کے باوجود، ہندوستان کے اندر ایک بے مقصد چیز ہو گئی۔ اس نے ہندوستانی سیاست پر کوئی پائیدار نقش نہیں چھوڑا بجز اس کے کہ اس نے مولویوں کو منظم ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ گاندھی کے کٹر مسلم ملاؤں کی، جو دیوبندی سنی کہلاتے تھے، جمعیت علمائے ہند کے نام سے ایک سیاسی تنظیم بنانے میں مدد کی جس نے مسلم لیگ اور اس کی قیادت کی سختی کے ساتھ مخالفت کی۔ بریلویوں نے جو زیادہ ضعیف الاعتقاد مگر زیادہ روادار بھی تھے، تحریک خلافت میں کوئی کردار ادا نہیں کیا اس لیے کہ عثمانیہ خلیفہ ان کے لیے قابل قبول نہیں تھا کیونکہ وہ اولاد قریش سے نسبت نہیں رکھتا تھا یہ بات ملحوظ رہے کہ جمعیۃ العلمائے ہند کے علاوہ علماء کی دیگر دو شدید روایتی مذہبی و سیاسی تنظیمیں بھی مجلس احرار اور جماعت اسلامی کے نام سے قائم ہوئیں۔ یہ سب تنظیمیں مسلم لیگ اور اس کی مغرب سے متاثر قیادت کی کٹر مخالف تھیں، اور انجام کار انہوں نے بھی مطالبہ پاکستان کی پوری شدت کے ساتھ مخالفت کی۔

یہ مذہبی پارٹیاں اس قدر عوامی حمایت حاصل نہیں کر سکیں کہ وہ مسلم لیگ کا راستہ روکنے کے قابل ہو جاتیں۔ کچھ مسلم لیگی افراد جیسے علی برادران اور جناح کے متبنّی نوجوان راجا امیر احمد خان محمود آباد (بیٹا) تھوڑے عرصے کے لیے اسلامی نظریئے سے متاثر ہو گئے تھے۔ مگر جیسا کہ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ایک وقتی تاثر تھا۔ انہیں جلد احساس ہو گیا کہ یہ بنیاد پرست نظریہ ایک خام خیالی

ہے۔ اسی طرح، علی برادران اور ان جیسے دوسرے لوگ بھی جلد سیکولر پسند مسلم لیگ میں واپس آ گئے تحریک خلافت کا ایک درمیانی وقفہ مسلم لیگ کو ایک مذہبی نظریاتی تحریک میں نہ بدل سکا۔ یہ صرف آزادی سے ذرا قبل ممکن ہوا کہ لیاقت علی خاں جمعیۃ العلمائے ہند کے چند علماء کو اس بات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ ہجرت کر کے پاکستان آ جائیں جہاں ہندوانڈیا کے مقابلے میں ایک مسلم ریاست میں ان کو ترقی وخوشحالی کے بہترین مواقع میسر ہوں گے۔ یہاں آ کر انہوں نے جمعیۃ العلمائے پاکستان قائم کر لی۔ ضیاء کا دور حکومت آنے تک ریاستی اقتدار پر ان علماء کا کوئی اثر ونفوذ نہیں تھا۔ اس تمام عرصے میں تحریک پاکستان مسلمانوں کی ایک سیکولر تحریک رہی، نہ کہ اسلام کی تحریک۔

بہرنوع، جناح جیسے سیکولر پسند جو تحریک خلافت کے زمانے میں مسلم لیگ چھوڑ چکے تھے، دوبارہ لیگ میں شامل ہو گئے۔ اس وقت تک، بنیادی طور پر بدلے ہوئے سیاسی (اور آئینی) پس منظر کے لحاظ سے یہ ایک بدلی ہوئی مسلم لیگ بن چکی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم اقلیتی صوبوں جیسے یوپی اور اس کے تنخواہ دار طبقے کے بجائے اکثریتی صوبے اور ان کے بااثر اور متمول جاگیردار توجہ کا مرکز بن گئے۔ حکومت ہند کے ایکٹ ۱۹۱۹ء کے تحت، Montogue-Chelmsford اصلاحات کے نفاذ کی وجہ سے یہ چیز وقوع پذیر ہوئی۔ اس ایکٹ کے تحت، صوبائی حکومت کے چند مخصوص محکموں میں، صوبائی سطح پر، ہندوستانی وزراء کو اختیارات منتقل کر دیئے گئے۔ اس سے ہندوستان کے اندر ایک نئی منطق داخل ہو گئی۔ اس وقت سے سرکاری ملازمتوں اور وظائف وغیرہ دینے کا اختیار مسلسل ہندوستانی وزراء کے ہاتھوں میں رہا۔ جس نے سیاسی حمایت کو وسیع کرنے کے عمل میں اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔

یوپی کے مسلمان اور مسلم اقلیتی صوبے اور ان کے تنخواہ دار اور پیشہ ور طبقے، جو مسلم لیگ کی طاقت کی خاص بنیاد تھے، اقلیت میں تھے اور حکومت قائم نہیں کر سکتے تھے، اب میدان سے باہر ہو چکے تھے۔ نہ ہی مسلم لیگ اپنے طور پر بااثر جاگیرداروں کی حمایت حاصل کر سکی تھی۔ ان کی خود اپنی سیاست تھی۔ مسلم لیگ نے ان کی حمایت پر ہی انحصار جاری رکھا مگر اب یہ اس کے پہلے روپ کا ادنیٰ سایہ تھا۔

پنجاب میں، مسلمان جاگیردار ہندو اور سکھ جاگیرداروں اور مشرقی پنجاب کی جاٹ برادری

(سر چھوٹو رام کی قیادت میں) کے اشتراک اور unionist پارٹی کے پرچم کے سائے تلے اکٹھا ہو جانے کی بدولت، پنجاب کی سیاست پر حاوی ہو گئے۔ اس پارٹی کے صدر سر فضل حسین تھے جو خود جاگیردار نہیں تھے مگر جاگیرداروں کی ضرویات سے ان سے زیادہ بہتر طور سے واقف تھے۔ جاگیرداروں کی حیثیت سے اپنے واضح طبقاتی مفادات کے ساتھ Unionist پارٹی نے اپنے نظریئے میں پنجابیت یعنی پنجابی قوم پرستی کو بھی شامل کر لیا۔ ہندوستان کے دیگر حصوں کی انقلابی سیاست کے اثرات کے بارے میں وہ بہت زیادہ محتاط تھے۔ Unionists کو یقین تھا کہ انگریز ہندوستان پر ہمیشہ حکمرانی کرتے رہیں گے لہٰذا جب تک برطانوی حکومت کے ماتحت، معاملات خوش اسلوبی سے چلتے رہیں، انہوں نے اپنے مقاصد کو پنجاب پر حکومت کرنے، اس سے فائدے اٹھانے اور اسے بیرونی اثرات سے محفوظ رکھنے تک محدود کر رکھا تھا۔ جیسے ہی آزادی ملنے کے (کانگریس کی حکومت کے تحت) آثار نمایاں ہوئے، انہوں نے برطانوی دولت مشترکہ کے اندر رہتے ہوئے ایک آزاد پنجاب حاصل کرنے کو ترجیح دی۔ وزیر اعلی سکندر حیات نے، فضل حسین کے جانشین، برطانوی سامراج کے اندر رہتے ہوئے ایک آزاد پنجاب کے لیے چرچل کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن، درایں صورت، یہ منصوبہ ناکام رہا۔ فضل حسین پنجابی متوسط طبقے کو دو حریف گروپس میں تقسیم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ شہری اور دیہی۔ دیہاتوں سے تعلق رکھنے والے تنخواہ دار اور پیشہ ور لوگوں کو جنہیں جاگیرداروں کی سرپرستی حاصل تھی، ترجیح دی گئی۔ دوسری جانب، سہولتوں سے محروم شہری مسلمان ایک ایسی اقلیت تھے جنہیں unionists کے زیر حکومت پنجاب میں نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ سماجی بے انصافی سے دل برداشتہ ہو کر ان میں سے بہت سے لوگ، ان کی جوشیلی تقریروں سے متاثر ہو کر مجلس احرار کے بنیاد پرست مذہبی گروپس میں شامل ہو گئے۔ مسلم لیگ کمزور اور غیر مؤثر تھی اور unionists پر اس کا اس قدر انحصار تھا کہ وہ اپنے طور پر ان لوگوں کی رہنمائی کے قابل نہیں تھی۔ پنجابی جاگیرداروں، بالخصوص فضل حسین کی نظر میں مسلم لیگ اتنی طاقتور حریف نہیں تھی کہ صوبے میں ان کے اقتدار کے لیے خطرے کا باعث بن سکے۔ وہ اسے برداشت کرتے رہے بلکہ اس کی سرپرستی بھی کی اور جب ضرورت پڑی تو اسے اپنی مقصد براری کے لیے استعمال کیا۔ چنانچہ، سکندر حیات نے بھی جناح کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا۔

IV

۱۹۴۰ء کے عشرے کے وسط میں پہنچ کر، جب آزادی تک رسائی ایک حقیقت کے روپ میں نظر آنے لگی، پنجاب کے جاگیرداروں کو احساس ہوا، اول یہ کہ دولت مشترکہ میں رہتے ہوئے انہیں ایک آزاد پنجاب نہیں ہوگا، جو ان کی خواہش تھی۔ دوئم یہ کہ اگر انڈین نیشنل کانگریس کے ماتحت پنجاب کو آزادی ملتی ہے تو یہ ان کی بقاء کے لیے ایک مہلک خطرہ ثابت ہوگی۔ کانگریس زرعی اصلاحات (land reforms) کا پختہ عہد کر چکی تھی جس کے لیے خود پنڈت نہرو کی زیر صدارت ایک کمیٹی چند برسوں سے کام کر رہی تھی۔ اپنے طبقے کی بقاء کی خاطر، پنجابی جاگیردار اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلم لیگ کے تحت پاکستان ان کے لیے ایک قابل عمل متبادل ہے۔ یہ اس لیے بھی زیادہ مناسب تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر وہ لیگ میں شامل ہوتے ہیں تو وہ فی الاصل اس پر قابض ہو جائیں گے۔ وہ اسے اپنے قابو میں رکھیں گے۔ یہ نکتہ سمجھنے والوں میں سب سے پہلے شخص میاں ممتاز دولتانہ تھے اور وہ ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے ۱۹۴۵ء تک تقریباً تمام باثر جاگیردار مسلم لیگ میں شامل ہو چکے تھے سوائے خضر حیات خان کے زیر اثر بچے کھچے کچھ لوگوں کے جو ابھی تک دولت مشترکہ میں رہتے ہوئے، ایک آزاد پنجاب حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے جو انگریز انہیں دینے والے نہیں تھے۔ سندھ کی صورتحال بھی پنجاب سے ملتی جلتی تھی۔ لہٰذا آزادی کی نوبت آنے تک سندھ اور پنجاب کے باثر جاگیردار مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔

اپنی ذات کی بقاء میں دلچسپی کے سوا، مسلم لیگ میں شامل ہونے کے لیے انہیں کسی نظریئے کی ضرورت نہیں تھی۔ کسان جن پر وہ کلی طور پر حاوی تھے اپنے زمینداروں کی ہدایت کے مطابق ووٹ ڈالتے تھے جس کے لیے انہیں کوئی نظریہ درکار نہیں تھا۔

چنانچہ، تحریک پاکستان کے پیچھے کوئی مذہبی نظریہ کارفرما نہیں تھا۔ اور مشرقی بنگال کے علاوہ، صحیح معنی میں، اس کی حمایت میں کوئی عوامی تحریک نہیں چلی۔ پنجاب اور سندھ کے بہت سے پیر صاحبان ان بڑے باثر جاگیرداروں میں شامل تھے، جنہوں نے پاکستان کو قبول کر لیا۔ ان کے ایما پر ان کے مریدوں نے پاکستان کے لیے خوب خوشیاں منائیں۔ اس سے کچھ دانشوروں نے یہ تاثر لیا کہ پاکستان کے تصور نے ان کے اندر یہ جوش وولولہ پیدا کیا تھا جبکہ حقیقت حال یہ ہے

کہ وہ یہ جشن اس لیے منا رہے تھے کہ ان کا پیر خوش ہے اور ان کے پیر کی خوشی کا سبب یہ تھا کہ اس نے لیگ میں شامل ہو کر کانگریس کے زرعی اصلاحات کے خطرے کو ٹال دیا تھا۔

'اسلامی' نظریے کا شور دراصل پنجاب میں مچایا گیا، مسلم لیگ کی جانب سے نہیں۔ اسلام کی دہائی انتہا پسند تنظیم مجلس احرار نے دی جو مسلم لیگ کی پوری شدت کے ساتھ مخالفت کرتی تھی اور ان کے رہنماؤں کو کافر قرار دیتی تھی۔ یہ پنجاب کی اکلوتی عوامی تحریک تھی جس نے اسلام کے نام کا سہارا لے کر پاکستان کے تصور کی مخالفت کی۔ مجلس احرار کی طاقت کی بنیاد شہری علاقوں کے چھوٹے بورژوا تھے۔ یہ وہ نچلا متوسط طبقہ تھا جسے unionists پارٹی کی شہری علاقوں سے بے نیازی کی پالیسی کی بنا پر نظر انداز کر دیا گیا تھا جس کے ساتھ مسلم لیگ اشتراک کر چکی تھی۔

صرف بنگال کے اندر، مسلم لیگ نے ۱۹۴۵ء کے انتخابات کے موقع پر ایک حقیقی عوامی تحریک کی رہنمائی کی مگر یہ کوئی مذہبی تحریک نہیں تھی۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات ہونے تک مسلم لیگ ڈھاکہ کے نواب خاندان اور ان کی ایک مختصر سی ہم خیال جماعت یعنی بنگالی جاگیرداروں کے کنٹرول میں تھی۔ ان کا مقابلہ کرشک پروجا پارٹی (Krishak Proja Party) سے تھا جس کی قیادت فضل الحق کر رہے تھے جن کی سیاسی طاقت کا انحصار کسان طبقے پر تھا۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے حتمی نتیجے میں دونوں پارٹیوں کے ووٹوں کی تعداد تقریباً برابر تھی اور انہوں نے مخلوط حکومت (coalition government) بنائی۔

۱۹۴۳ء میں بنگال میں پڑنے والے بڑے قحط میں ۳۵ لاکھ کے قریب وہ غریب کسان لقمہ اجل بن گئے جن کے پاس قحط کے دوران گذر اوقات کے لیے کوئی محفوظ رقم نہیں تھی۔ کسان لڑائی بھڑائی پر تل گئے۔ ان کی تحریک، تیبھاگا تحریک (Tebhaga movement) کے نام سے مشہور ہے جس کی مہم کمیونسٹوں کی قیادت میں آل انڈیا کسان سبھا نے چلائی۔ ۱۹۴۵ء کے انتخابات کے سلسلے میں بنگال کے کسانوں کو جوش دلانے کے پس منظر میں یہ تحریک شروع ہوئی۔ ۱۹۴۳ء میں ابوالہاشم نامی ایک نمایاں شخص بنگال کی صوبائی مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری منتخب ہو گئے۔ انہوں نے سوشلزم اور اسلام کا ایک غیر واضح مرکب (confused mixture) پیش کیا۔ انہوں نے مسلم لیگ کی حمایت کو ایک منظم شکل میں ڈھالنے کا کام سنبھال لیا جس کے لیے انہوں نے تیبھاگا تحریک کے مقامی دھڑوں کے سرگرم کارکنوں سے مدد لی۔ ڈھاکہ کے نواب

خاندان اور اب تک بنگالی صوبائی مسلم لیگ کو کنٹرول کرنے والے ممتاز رہنماؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے، ابوالہاشم نے مسلم لیگ کی انتخابی مہم کو منظم کیا۔ جس میں انہوں نے چھوٹے کسانوں کی ٹھوس ضروریات اور معاشی مطالبات پر توجہ مبذول رکھی۔ اگر اس عوامی تحریک کو آگے بڑھانے میں کسی نظریئے کا دخل تھا، تو وہ مذہبی نظریہ نہیں تھا۔ انہوں نے مسلم لیگ کے پیچھے چلنے والے کسان طبقے کو طبقاتی نعروں کے ذریعے متحرک کیا تھا، مذہبی نعروں سے نہیں۔

چنانچہ، بنگال میں ۱۹۴۵ء کے الیکشن کی مہم میں مذہبی نظریئے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ مہم کلی طور پر بنگالی کسانوں کے معاشی مطالبات کی بنیاد پر چلائی گئی، ابوالہاشم اور ان کے رفقاء کی فطانت (genious) کی وجہ سے یہ تحریک کو باآسانی آلودہ کر سکتے تھے۔ بنگالی کسان (جن کی غالب اکثریت مسلمان تھی) بہت بڑی حد تک جوٹ (jute) پر انحصار کرتے تھے جو ایک نقد فصل تھی اور اسی کے ذریعے وہ عالمی نقد معیشت (globalized cash economy) کے جال میں پھنس جاتے تھے۔ ان کا فوری تنازعہ تاجروں اور ساہوکاروں سے تھا۔ جو اتفاق سے سب ہندو ہوتے تھے۔ ابوالہاشم نے ان تمام معاملات کو خالصتاً معاشی، طبقاتی مسائل سمجھ کر حل کرنے کی کوشش کی اور انہیں فرقہ وارانہ کشیدگی کا رنگ اختیار کرنے سے بچایا۔ انہوں نے کسانوں سے وعدہ کیا کہ مستقبل کی پاکستانی حکومت، ان کی اپنی حکومت ہوگی۔ کسانوں کا راج۔ وہ حکومت ان کے قرضوں میں بتدریج کمی کرے گی اور تاجروں کو ان کے مفادات کے خلاف قیمتیں مقرر کرنے سے روکنے کے لیے عملی اقدامات کرے گی۔ کسانوں سے زمینداری سسٹم ختم کرنے کا وعدہ بھی کیا گیا۔ بنگال کے کسانوں کو یقین دلایا گیا کہ پاکستان میں کسانوں کا راج ہوگا۔ اگر اس سارے عمل کے پیچھے کوئی نظریہ تھا تو ہم اسے کسان نظریہ کہہ سکتے ہیں۔ بنگال کا معاملہ، جاگیردارانہ نظام میں جکڑے ہوئے پنجاب اور سندھ سے بالکل مختلف تھا۔ ابوالہاشم کی کامیاب انتخابی مہم کی بدولت لیگ نے صوبائی اسمبلی میں کل ۱۲۱ مسلم نشستوں میں سے ۱۱۴ نشستیں حاصل کرلیں۔ اس میں مذہبی نظریئے کا کوئی دخل نہیں تھا، لفاظی کی حد تک بھی نہیں۔ مگر، آخر میں کسانوں کو فریب دیا گیا (ہمیشہ کی طرح) ابوالہاشم سے اپنے مقاصد پورے کروالینے کے بعد طاقتور ڈھاکہ کے نواب گروپ کو انہیں اپنے راستے سے ہٹانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ فروری ۱۹۴۷ء میں انہیں غیر معینہ مدت کی رخصت پر ان کے آبائی گاؤں بردوآن (Burdwan) بھیج دیا گیا۔ بنگال کے

مسلم جاگیردار دوبارہ مسلم لیگ پر قابض ہو گئے۔ یہ ایک طویل کہانی ہے اور بجائے خود ایک دکھ بھری داستان ہے۔

حتمی نتیجہ، جو ہم سب کے سامنے ہے، یہ نکلا کہ ہمیں ایک ایسا پاکستان ملا جس پر جاگیردار حاوی تھے (مغربی پاکستان میں اور مشرقی پاکستان میں بھی) جنہوں نے حکمران بیوروکریسی سے گٹھ جوڑ کر لیا۔ حکمران گروپ میں جلد ہی انتہائی طاقتور ملٹری بھی شامل ہو گئی۔ پنجاب اور سندھ میں جاگیردار الیکشن میں کامیاب ہوتے تھے اور اس طرح انہوں نے اپنی جاگیردارانہ اقتدار برسوں تک ہمارے اوپر مسلط رکھیں۔ بنگال میں زبردست عوامی کامیابی کے باوجود، تقسیم کے وقت بنگالی مسلم جاگیردار دوبارہ اقتدار پر قابض ہو گئے۔ قیام پاکستان کے وقت، پاکستان کا مسئلہ مذہبی نظریہ نہیں تھا، بلکہ زیادہ صحیح یوں ہے کہ اس کا مسئلہ جاگیرداروں کا غلبہ۔

مولوی صاحبان کے موجودہ دعوؤں کے برعکس، مسلم لیگ نے تحریک خلافت کے درمیانی وقفے کو چھوڑ کر، اپنے سارے سیاسی سفر میں تواتر کے ساتھ اپنا سیکولر موقف برقرار رکھا۔ اسلامی نظریے کو مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر لانے کے لیے کئی مرتبہ کوشش کی گئی۔ لیکن ایسی کوششیں بہت کم ہوئیں اور ہمیشہ ناکام رہیں۔ اختصار کی خاطر، صرف ایک مثال کافی ہوگی اسلامی نظریے کو مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر لانے کی ان چند کوششوں میں سے ایک کوشش (attempt) کا ذکر شریف الدین پیرزادہ نے مسلم لیگ کی دستاویزات کے اپنے مرتبہ مجموعے میں کیا ہے۔ ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے دہلی کے اجلاس میں، عبدالحمید قاضی نامی شخص نے اس اجلاس میں اپنی تجویز کردہ قرارداد پیش کرنے کے لیے اراکین کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ قرارداد کا مقصد، مسلم لیگ کو اسلامی نظریہ تسلیم کرنے اور ایک اسلامی ریاست کی تخلیق کا پابند بنانا تھا۔ فوراً ہی ہر ایک رکن کی جانب سے قاضی صاحب پر زور ڈالا گیا کہ وہ اپنا یہ ارادہ ترک کر دیں۔ مسلم لیگ کے اندر، مذہبی پارٹیوں کے نقطہ نظر سے وسیع پیمانے پر اختلاف پایا جاتا تھا جس کے باعث مذہبی انتہا پسند بے اثر اور غیر اہم ہو گئے جو آل انڈیا مسلم لیگ اور اس کی قیادت کے کٹر مخالف تھے اور انجام کار قیام پاکستان کے بھی۔

مذہبی پارٹیاں، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، تحریک پاکستان کی شدید مخالف تھیں۔ پنجاب اور سندھ میں بااثر جاگیرداروں کی طاقت ۱۹۴۵ء کے انتخابات کے لیے درکار حمایت حاصل

کرنے کے لیے خود ہی کافی تھی اور یہاں کسی عوامی تحریک کی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی کوئی عوامی تحریک واقعتاً چلی۔ ہر شخص، جس نے پنجاب کے کسی گاؤں میں اچھا خاصا وقت گزارا ہے، اس بات کو محسوس کیا ہوگا۔

مشرقی بنگال میں، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں حقیقت میں ایک طاقتور عوامی تحریک چلی۔ تیبھا گا تحریک کے دھڑوں کی مدد سے، اس تحریک کی رہنمائی ایک غیر معمولی شخصیت ہاشم خان نے کی۔ ان کے نعرے، بہر صورت، واضح طور پر سیکولر تھے۔ شہروں کے اندر در حقیقت مختلف موقعوں پر عوامی مظاہرے کیے گئے۔ وہ مسلمانوں کے مطالبات کے حق میں نعرے لگاتے تھے اور یہ نعرے اسلام کے کسی مخصوص معنی میں نہیں تھے، اگر چہ کبھی کبھار اسلام کے نام کی آواز بھی ان میں شامل ہو جاتی تھی۔ لیکن اس بنا پر اسے ایک اسلامی عوامی تحریک نہیں کہا جا سکتا۔ کانگریس اور انگریزوں کے ساتھ، اعلیٰ سطحی مذاکرات کے ذریعے سارے معاملات طے کیے جاتے تھے۔ جب جناح نے پاکستان کے سیکولر نظریے کا اعلان کیا تو وہ اس تسلیم شدہ سیکولر نظریے پر مبنی موقف بیان کر رہے تھے جس پر مسلم لیگ اپنے سارے سیاسی سفر کے دوران سختی سے عمل پیرا رہی۔ بنیاد پرست اسلامی نظریے کا پاکستان کی تخلیق میں کوئی دخل نہیں تھا، اگر چہ اسلامی بنیاد پرستی کے ہم عصر نظریہ سازوں، بشمول دانشوروں کا دعویٰ ہے کہ اسلامی نظریے اور نعروں کی بدولت ہی پاکستان قائم ہوا اور یہ کہ اسی بنا پر اس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا اختیار بھی انہی کو حاصل ہے۔

پاکستان، افغانستان اور انڈیا

Pakistan, Afghanistan and India

پاکستان اس وقت انتہائی مشکل حالات سے گزر رہا ہے۔ امریکہ نے اپنی افغانستان کی جنگ میں پاکستان کو زبردستی گھسیٹ لیا ہے جسکی اسے بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بھارت کے ساتھ خطرناک فوجی تصادم جنگ میں تبدیل ہونے کے اثرات نظر آ رہے ہیں جبکہ دونوں ممالک یہ جنگ نہیں چاہتے۔ جنوبی ایشیا کے باشندے جو کہ سیکیولر جمہوریت کے حامی ہیں اس صورتحال میں اُلجھن میں پھنس گئے ہیں۔ پاکستان کے فوجی حکمران نے ملک میں اسلامی بنیاد پرستی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا ہے اور ظاہری طور پر وہ سیکیولر اقتدار کو پروان بھی چڑھا رہا ہے۔ جبکہ اس کے مد مقابل ایک وقت میں فخر یہ سیکیولر انڈیا اس وقت انتہا پسند ہندو بنیاد پرست ہندوؤں کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ انھوں نے یہ اقتدار ووٹ اور بیلٹ بکس کے ذریعے حاصل کیا ہے۔ انھوں نے پاکستان کے خلاف جنگ کی دھمکی بھی دے دی ہے۔ سیکیولرزم اور جمہوریت ب ایک دوسرے کے مد مقابل ہیں۔

پاکستان اور افغانستان.

۱۹۸۰ کی دہائی میں پاکستان میں اسلامک انتہا پسندی کو بڑھاوا۔ پاکستان سے ہو.ی سمران جنرل ضیاء الحق کے دور میں ملا جنھیں امریکی صدر ریگن نے اس بنیاد پر بھرتی (recruited) کیا تھا کہ وہ CIA کے ساتھ ملکر روس کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کے لئے افغان جنگجوں (war lords) کو اکٹھا کریں اور اسلام کے نام پر ایک جہاد شروع کریں۔ سعودی عرب کے

پیسے اور امریکہ کی مدد سے پاکستان اور افغانستان میں ایک جہادی ثقافت کو فروغ دیا گیا۔ دونوں ملکوں میں اسلام جہادی گروہوں کو نہایت حساس اور تباہ کن ہتھیار (مثلاً اسٹرینگر اور سام SAM میزائل) مہیا کئے گئے اور ان کو ان کے چلانے کے لئے CIA نے ضروری تربیت بھی مہیا کی۔ امریکہ اور پاکستان نے افغان جنگ میں افغان جنگجوں کی بھرپور مدد کی۔ سوویت یونین کو افغانستان سے نکالنے کے لئے ان جنگجو کو بھرپور مدد فراہم کی گئی۔ مگر سوویت یونین کی فوجوں کے اُنخلاء کے بعد ان جنگجوؤں نے اپنے ملک کے اندر تباہی پھیلا دی۔ اس بدامنی اور لاقانونیت کے اس تناظر میں امریکہ اور پاکستان میں افغان طالبان کے سرپرستوں نے ان کو ایوانِ اقتدار تک پہنچنے میں مدد دی۔

تیل، افغانستان اور طالبان:

امریکہ کی تیل پیدا کرنے والی کمپنی یونی کول (UNICOAL) کے مفادات امریکہ کی افغان پالیسی کا ایک اہم مرکز ہیں۔ UNICOAL کی خواہش ہے کہ وہ وسطی ایشیا کے ممالک سے گیس اور تیل کی پائپ لائنیں افغانستان کے راستے (ایران کو نظرانداز کرتے ہوئے) پاکستان کے ساحلوں تک پہنچادے۔ لیکن جنگی جنگجوں (war lords) کے قبضے میں گھرے ہوئے غیر مستحکم افغانستان کی بدامنی میں اس قسم کی سرمایہ کاری کوئی سودمند فیصلہ نہ ہوتا۔ پاکستان میں بینظیر بھٹو کی حکومت کو حرکت میں لایا گیا تاکہ وہ ان معاملوں کو براہ راست اپنے ہاتھ میں لیں۔ ۱۹۹۴ میں پاکستان نے طالبان کو منظم ہونے اور انکو اقتدار ایوان کی راہداریوں تک پہنچنے میں بھرپور مدد فراہم کی گئی۔ امریکی حکومت نے بھی طالبان کی حمایت کا فیصلہ کیا کیونکہ طالبان ایران کے خلاف اپنی نفرت کا کھل کر اظہار کر چکے تھے اور وہ اس بات کے لئے بھی پُرعزم تھے کہ وہ افغانستان سے پوست اور منشیات کی پیداوار کا خاتمہ کر دیں گے جس کی پیداوار افغانستان کی خانہ جنگی کے دوران اپنے عروج تک پہنچ گئی تھی۔ طالبان کے اقتدار سنبھالتے ہی امریکہ نے مطمئن ہو کر دیگر تمام معاملات پاکستان اور UNICOAL کے حوالے کر دیئے اور خود دور سے بیٹھ کر ان معاملات پر نظر رکھتا رہا لیکن ۱۹۹۷ کے آواخر میں طالبان کی بڑھتی ہوئی انتہائی ظالمانہ رویوں اور خصوصی طور پر خواتین کے خلاف انکے اقدامات نے طالبان کے خلاف عوامی ردعمل کو بڑھاوادیا۔

امریکہ میں بالخصوص خواتین کے مختلف گروہوں اور NGOs نے UNICOAL اور کلنٹن انتظامیہ پر زور ڈالنا شروع کیا کہ طالبان کے سلسلے میں اپنی پالیسی پر نظرثانی کریں ۱۹۹۶ کے امریکی انتخابات میں کامیابی کے لئے بل کلنٹن کے لئے خواتین کے ووٹوں کی بڑی اہمیت تھی اور وہ اسے کسی صورت نظرانداز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اسی دوران طالبان نے اپنے لئے مصیبت کو اس وقت دعوت دی جب انھوں نے اسامہ بن لادن کو اپنے ملک میں پناہ دینے کا فیصلہ کرلیا جو کہ پہلے ہی امریکہ اور سعودی عرب کے خلاف اعلان جنگ کر چکا تھا اور اسے کینیا اور تنزانیہ میں امریکہ کے سفارتخانوں پر اگست ۱۹۹۸ میں ہونے والے حملوں کا ذمہ دار سمجھا جارہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اسی دوران مونیکا سیلس کا اسکینڈل سامنے آیا اور شرمندگی کے باعث عوام کی توجہ اس اسکینڈل سے ہٹانے کے لئے امریکی صدر بل کلنٹن کو عجلت میں بغیر کسی منصوبہ بندی کے افغانستان پر میزائیلوں سے حملہ کرنا پڑا۔ اس کا مقصد القاعدہ کا خاکہ اور اسامہ کی ہلاکت تھا۔ یہ حملے خلیج فارس میں کھڑے امریکی بحری جہازوں سے کئے گئے۔ اس مرحلے پر UNICOAL نے یہ بات محسوس کی کہ اسے چاہے دکھاوے کے لئے ہی بہرحال وقتی طور پر طالبان سے اپنے قطع تعلق کا مظاہرہ کرنے کیلئے افغانستان سے اپنے آپ کو باہر نکالنا پڑے گا۔

اس کے باوجود امریکہ اور UNICOAL کے طالبان کے ساتھ خفیہ طریقوں (Backroom contact) سے تعلقات قائم ہے۔ تین برس بعد امریکہ نے اس صورتحال کا دوبارہ جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ فروری ۲۰۰۱ میں بش انتظامیہ اور طالبان کی قیادت کے درمیان انتہائی خفیہ مذاکرات ہوئے جنکے متعلق اطلاعات دو فرانسیسی خفیہ ایجنسیوں کے افسران نے فراہم کی۔ انکی اطلاعات کے مطابق بش انتظامیہ طالبان حکومت کو دہشتگردوں کی مدد کرنے کے باوجود تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو چکی تھی۔ ان کی رپورٹ کے مطابق امریکہ طالبان کو وسط ایشیا میں امن کے قیام کا ایک اہم مہرہ سمجھتی تھی۔ لیکن طالبان کی تنگ نظر اور کٹر پالیسیوں کی وجہ سے مذاکرات مزید آگے نہ بڑھ سکے۔ بش نے طالبان کو انتہائی سخت گیر الفاظ میں دھمکی دی" یا تو ہمارا سونے بھرا تخت قالین قبول کریں یا پھر ہم آپ کو بموں کے قالین تلے دفن کردیں گے" بش نے اپنا وعدہ نبھایا۔ ۱۱ ستمبر کو امریکہ میں ہونے والے خوفناک حملوں نے آخر امریکہ کو یہ موقع فراہم کیا کہ طالبان سے اپنی جان چھڑائے اور اس کی جگہ پر ایسی حکومت لے آئے جس کے ساتھ وہ اپنے

تعلقات بہتر طریقے سے قائم کر سکے۔ لیکن لگتا ایسا ہے کہ بون (جرمنی میں حامد کرزئی کے زیر قیادت ایک کمزور عبوری حکومت تشکیل دی گئی جس میں آپس میں تمام تر اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کے کٹر مخالف جنگی جنگجو باعث مجبوری ایک جگہ اکٹھا ہو گئے ہیں جو کہ امریکہ اور UNICOAL کے مستقبل کے منصوبوں میں کوئی خاص ادا کرنے کے قابل نہیں۔ جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ سابقہ افغان جنگجو ملک کے دیہی علاقوں میں دوبارہ سرگرم عمل ہو چکے ہیں اور مرکزی حکومت کے اختیار کو بڑی دلیری سے چیلنج کرر ہے ہیں

پاکستان میں سیکیولرزم اور اسلامی بنیاد پرستی کا مقابلہ:

پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت سے قبل اسلامی بنیاد پرتی کے بہت کم اثرات تھے لیکن جنرل ضیاء الحق نے سعودی عرب اور CIA کی مدد سے اس ملک میں بنیاد پرتی کو فروغ دیتے ہوئے اسے انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ بہت قلیل عرصے میں دینی مدرسوں کا ایک بڑا وسیع جال پورے پاکستان میں پھیلا دیا گیا۔ فراخدلی سے ملنے والی مالی امداد کے نتیجے میں ان مدرسوں میں دیہاتوں کے غریب کسانوں کے بچوں کو مفت رہائش اور کھانے کا جھانسہ دیکر انھیں دینی تعلیم سے آراستہ کرنا شروع کیا گیا۔ مدرسوں میں دی جانے والی تعلیم دراصل انہیں مذہبی رجعت پسند بنانے کے لئے تھی۔ کئی مدارس نے اپنے طالبعلموں کو فوجی تربیت بھی مہیا کی اور ساتھ ہی افغان طالبان کے لئے پیادے سپاہی (foot soldier) بھی پیدا کئے اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کے مذہبی انتہا پسند جہادی گروپوں کو بھی سپاہی مہیا کئے۔ ان مدرسوں کے طالبعلموں کو اس طرح سے تیار کیا گیا تھا (جنونی بنایا گیا تھا) کہ وہ اپنے عقائد کے لئے جان کی قربانی دینے کو بھی تیار رہیں۔ افغان طالبان کی بیشتر قیادت پاکستان کے دیوبندی اور وہابی مدرسوں کی پیداوار تھی۔ ان افغان طالبعلموں نے پاکستان میں اپنے سرپرستوں یعنی جمعیت علماء اسلام کے دونوں دھڑوں سے اپنے تعلقات کو ہر صورت قائم رکھا۔ ان مدارس کی ۷۰ فیصد تعداد کا تعلق دیوبندی (وہابی) روایات سے تھا جبکہ ان مدارس میں زیر تعلیم طالبعلم ملک کے تمام دینی مدارس کے طالبعلموں کی تعداد کا ۴۰ فیصد بنتا ہے۔

سعودی عرب نے بعض ایران اور شیعہ مخالفت مدرسوں کی بھرپور مالی مدد کی جبکہ دوسری

طرف ایران نے دوسرے طریقے سے اپنے معاملات کو آگے بڑھایا لیکن اس کے باوجود شیعہ مدرسوں کی تعداد ۴ فیصد سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ان مدارس میں انتہا پسند فرقہ وارانہ گروہ کے لئے رضا کاروں کی بھرتیاں کی گئیں اور انھیں خطرناک اسلحہ بھی فراہم کیا گیا۔ پاکستان ان حالات میں وہ میدان جنگ بن گیا جہاں مشرقی وسطی کی "مسلمان" طاقتوں نے اپنی خانہ جنگیوں (Proxy war) میں لڑنے کا فیصلہ کیا اور فرقہ وارانہ فسادات اس نہج تک پہنچ گئے کہ جن کی تاریخ میں پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی۔ پاکستان کا سماجی ڈھانچہ اس صورتحال میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونا شروع ہو گیا۔ مذہبی رہنماؤں نے مہم جوئی کے لئے حدائف مقرر کر لئے۔ انھوں نے اس بات پر زور دینا شروع کر دیا کہ پاکستان درحقیقت ایک اسلامی ریاست قائم کرنے کے لئے وجود میں آیا تھا اس لئے علماء کرام کو یہ حق حاصل ہے کہ پاکستان کی ریاست کا انتظام ان کے (مذہبی قیادت) کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ جنرل ضیاء الحق کے بعد آنے والی مسلم لیگ اور PPP کی حکومتوں نے اسکولوں اور جامعات اور نشر و ابلاغ کے ذرائع کے ذریعے ملک میں اسلامی بنیاد پرتی کے نظریات کو فروغ دینے کے عمل کو جاری رکھا اور پھر حالات یہاں تک پہنچ گئے کہ اکثر و بیشتر پاکستانیوں نے اس بات پر یقین کرنا شروع کر دیا کہ پاکستان واقعی ایک اسلامی ریاست قائم کرنے کے لئے وجود میں آیا تھا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی بنیاد سیکولر روایات پر قائم تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کسی بھی طرح ایک مذہبی تحریک نہ تھی۔ درحقیقت یہ پارٹی مغربی تعلیم یافتہ پیشہ ورانہ اور تنخواہ دار طبقے سے تعلق رکھتی تھی جن کے لئے حکومت کی ملازمتیں حاصل کرنا سب سے زیادہ اہم تھا۔ ان لوگوں نے بڑی کامیابی سے مسلم لیگ پر مُلّاؤں کے بڑھتے ہوئے اثر کو روک دیا۔ بانئ پاکستان محمد علی جناح نے تحریک پاکستان کی سیکولر بنیادوں کی دوبارہ تجدید پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ان الفاظ میں کی کہ "ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے مذہبی معنوں میں نہیں، کیونکہ ایمان ہر انفرادی شخص کا ذاتی معاملہ ہے لیکن سیاسی معنوں میں اور ریاست کے شہری ہونے کے باعث" پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بننا تھا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں جنرل ضیاء الحق کے برسر اقتدار آنے اور ۱۹۸۰ء کی دہائی کے بعد ملک میں اسلامی نظریہ کی بڑھ چڑھ کر تشہیر و اشاعت کی گئی اور ریاست کے سیکولر ہونے کو کفر سے تعبیر کیا گیا۔

مشرف کی "سیکیولرزم"؟

۱۹۹۹ء میں جنرل مشرف نے ایک فوجی بغاوت کے ذریعے اقتدار حاصل کیا تو اس وقت نواز شریف کی ''جمہوری'' حکومت کی سرپرستی میں پروان چڑھنے والے ہتھیاروں سے لیس جہادی گروپ پاکستان کے سماجی ڈھانچے پر مکمل طرح سے چھائے ہوئے تھے۔ ضیاء الحق کی مہربانیوں سے فوج کے اندر بھی ان انتہاپسندوں نے اپنی جڑیں مضبوط کرلیں لیکن بہرحال پاکستانی فوج میں عمومی طور پر برطانوی نوآبادیاتی دور کی روایات اپنے زیادہ گہرے اثرات رکھتی ہیں۔ نوآبادیاتی حکمرانوں نے اپنے دورحکومت میں برطانوی فوج کے ہندوستانی افسران میں پیشہ ورانہ صلاحیتوں کوفروغ دینے کے نظریہ پرعمل کیا اورانھیں آزادی کی تحریک میں شریک ہونے سے بڑی کامیابی سے الگ تھلگ کیئے رکھا اس تربیت اور نظریئے نے ہندوستانی فوج کے افسران کے ذہنوں میں 'خودغرض' (self seeking politics) سیاست دانوں کے مقابلے میں اخلاقی برتری کا ایک تصور پیدا کر دیا۔ ان کے خیال میں یہ سیاست دان ان پڑھ عوام کا استحصال کرتے ہیں۔ اس نظریئے کے تحت فوجیوں کی فوجی عزت (military honour) اور اپنی یونٹ (regement) سے وفاداری فرض عین ہے۔ پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے نظریئے اور سیاست دانوں کو حقارت سے دیکھنے کا نظریہ آج بھی پاکستانی فوج کے افسران کے ذہنوں میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس صورتحال میں تھوڑی سی تبدیلی اس وقت آئی جب ضیاء الحق نے پچھلے نظریئے کے مقابلے میں اسلامی نظریہ کوفروغ دیناشروع کیا لیکن پھر بھی پیشہ ورانہ گروپ بااثر ہی رہا۔ ۱۹۹۵ میں فوج نے میجر جنرل عباسی کی زیرقیادت پیشہ ورانہ افسران کو ہٹا کر اسلامی نظریہ پرستوں کولانے کی ایک کوشش کوناکام بنادیا۔ ان افسران کا مقصد پاکستان اور آرمی کواسلامائز کرنا تھا۔ لیکن یہ اس میں ناکام رہے۔

یہ ناکام کوشش پیشہ ورانہ گروپ کے لئے انتہائی حیرت اور صدمہ کا باعث تھی۔ اس ناکام فوجی بغاوت نے فوج کے سینئر کمانڈروں کوفوج میں پیشہ وارانہ ترقی کےمطابق اندیشوں میں مبتلا کردیا۔ اس بغاوت کی ناکامی کے بعدکئی کٹر بنیاد پرست افسران کوفوج سے فارغ کردیا گیا لیکن اس کے باوجودکئی افسران بشمول سینئر عہدوں پر کام کرنے ولے افسران فوج میں باقی رہے۔

مشرف اور "پیشہ ورانہ" گروپ کے دیگر افسران کو ان طاقتور جنرلوں سے جو کہ اسلامی نظریئے سے کلی طور پر متفق تھے نمٹنے میں کافی دشواری پیش آئی۔ فوج اور معاشرے میں بنیاد پرستی کو روکنے کے لئے مشرف نے جناح کے سیکولر خیالات کو دوبارہ متعارف کرانے کی کوشش شروع کی لیکن لگتا ہے کہ مشرف کا اپنا کوئی نظریہ نہیں۔ وہ ایک مثبت پیشہ ورانہ (pregmatic) اور لچکدار شخص ہے جس کا پاکستانی فوج پر گہرا یقین ہے اور وہ بڑے یقین سے فوج کو ملک وقوم کی سلامتی کا محافظ سمجھتا ہے۔ باحیثیت pregmatic شخص کے لئے اس کے لئے اس بات میں کوئی مشکل حائل نہ تھی کہ وہ ایک پالیسی کو چھوڑ کر دوسری پالیسی کی حمایت شروع کر دے بشرط یہ تبدیلی زیادہ فائدہ مند ہو۔ اسی وجہ سے انکو پچھلی پالیسیوں کو چھوڑ کر بش کی دہشتگردی کے خلاف جنگ میں شریک ہونے میں کوئی زیادہ مشکل پیش نہ آئی۔ جنرل مشرف کی قبل ازیں طالبان کے لئے حمایت کسی اسلامی نظریئے کی بنیاد پر نہ تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ طالبان کے کابل کو فتح کرنے کے کامیابی کے پس پردہ پاکستان افواج کی حمایت اور مدد شامل حال تھی۔ یہ کامیابی درحقیقت پاکستانی فوج کی تاریخ میں میدان جنگ میں حاصل ہونے والی پہلی تاریخی کامیابی تھی۔ مشرف نے بہ حیثیت ایک پیشہ ورانہ فوجی کے اس کامیابی کا سہرا اپنے نام لکھا لیکن اسے بہت جلد اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ افغان طالبان ہارے ہوئے گھوڑے ہیں جنکی مزید حمایت نقصان کا باعث بن سکتی ہے، اور اسی لئے اس نے بڑی آسانی سے اس تبدیل ہوتی صورتحال میں انتہاپسندی کے خلاف امریکی جنگ میں شریک ہونا سود مند سمجھا۔ اپنا اقتدار سنبھالنے کے فورا بعد جنرل مشرف نے اس سمت کی نشاندہی کی جس پر وہ چلنا چاہتے تھے۔ ان کے لئے ان کا ہیرو ایک سیکولر مسلمان سپاہی کمال اتاترک تھا۔ جنرل مشرف ناموس رسالت کے بدنام زمانہ قانون کو جس کا نفاذ جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں پیدا ہوا تھا اور جس کا شکار بہت سے معصوم لوگ بالخصوص عیسائی بنتے چلے آئے تھے اس میں تبدیلی کی ناکام کوشش کی۔ تبدیلی کی یہ کوشش فوج میں موجود کٹر اسلام پرستوں کے لئے ایک بہت بڑی تبدیلی تھی۔ اس پر شدید غصے کا اظہار کیا گیا اگر یہ شور شرابا اور احتجاج صرف عوام کی طرف سے ہوتا تو شاید جنرل مشرف اسکا کوئی لحاظ نہیں کرتے لیکن فوج کی طرف سے بھی اس مسئلے پر مزاحمت ایک بڑی اہم بات تھی۔ فوج کا "پیشہ ورانہ" گروہ اب تک اپنی گرفت حالات پر مستحکم نہیں کر سکا تھا جو کہ جنرل مشرف نے بعد ازاں کر دکھائی لیکن وقتی طور پر جنرل مشرف کو اپنی بات

سے یقیناً پیچھے ہٹنا پڑا۔ اب جنرل مشرف فوج کے معاملات پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے ہیں اور باوجود عندیہ دینے کے وہ ابھی تک جنرل ضیاء الحق کے دور کے قوانین میں کوئی بڑی تبدیلی لانے میں کامیابی حاصل نہیں کر سکے جو کہ آج بھی اسلام کے نام پر ملک میں نافذ ہیں۔ لگتا ہے کہ ابھی پاکستان عوام اور خاص طور پر فوج کے ذہنوں میں جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں متعارف کرائے گئے اسلام کی بنیاد پرستانہ خیالات کو نکالنے کے لئے بڑا وقت درکار ہے۔ کشمیری جہادی عناصر کی بڑھتی ہوئی طاقت پاکستانی فوج کے "پیشے ورانہ" گروپ کے لئے شدید تشویش کا باعث بنتی چلی گئی۔ انتہا پسند مسلح جہادی گروپ فوج کے نعم البدل کے طور پر سامنے آتے چلے گئے جو پرویز مشرف جیسے "پیشہ ورانہ" جنرلوں کے لئے شدید دھچکا اور پریشانی کا باعث تھا۔ یہ تبدیلی درحقیقت فوج کے ملک کے دفاع کے تصور کو چیلنج کرنے کے Monopoly مترادف تھا۔ جہادی گروپ اپنے خودکار اور خطرناک ہتھیاروں کے ساتھ خود فوج کے لئے خطرہ بن گئے سال ۲۰۰۱ کے موسم گرما میں یہ مسلح اسلامی گروپ ملک کے کونے کونے میں فرقہ ورانہ فسادات پھیلانے میں مصروف ہو گئے۔ اس عرصے میں کئی شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والے باصلاحیت اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹر، انجینئر، بیوروکرولس اور اساتذہ افراد کو قتل کیا گیا۔ صرف کراچی شہر میں قتل کئے جانے والے شیعہ ڈاکٹر کی تعداد ۶۸ تھی۔ قتل کئے جانے والوں میں نہ صرف شیعہ شامل تھے بلکہ اس میں سُنّی تحریک کے سربراہ کو بھی قتل کیا گیا جو کہ دیوبندی (وہابی) مسلک کے حریف تھے۔ جواب میں شیعہ افراد نے کئی سنیوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ ایرانی سفارتخانوں کو وہابیوں نے قتل کیا ان فرقہ ورانہ لڑائیوں میں ہلاک ہونے والے افراد کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچی۔ حکومت کے اہل کاروں بالشمول کئی سینئر پولیس افسران بھی اس فرقہ ورانہ لڑائی کی نذر ہو گئے۔ خوف کی اس صورتحال میں کئی ججوں نے فرقہ ورانہ ہلاکتوں کے ملزمان اور ناموس رسالت کے مقدمات سننے سے انکار کر دیا۔ ایک جج کو اس کے دفتر میں اس بنا پر ہلاک کر دیا گیا کیونکہ اس نے فرقہ ورانہ فساد کے ملزم کو قتل کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے اسے سزا دینے کا اعلان کر دیا۔ فوج کے "پیشہ ورانہ" گروپ کے لئے ریاست کے نظام (machinery) کے اندر سے ان فرقہ ورانہ تنظیموں کی حمایت بہت بڑا چیلنج بن گیا تھا۔ یہ ریاست کے طاقت کے مرکزوں کے درمیان ایک تضاد کا پیش خیمہ بن گیا۔ جنرل مشرف اور اس کی ٹیم ان لوگوں کی مخالف ہوتی چلی گئی جو کہ ان مذہبی انتہا پسندوں کے قریب

تھی۔ یہ تضاد ایک اور پہلو بھی رکھتا تھا۔فوج کے پیشہ ورانہ گروپ نے مرکز میں اپنا کنٹرول سنبھال لیا لیکن ان مذہبی نظریہ دانوں نے ریاست کے مقامی سطح پر بدعنوان اور نالائق مقامی اہلکاروں کے ساتھ ملکر نچلی سطح پر اپنا اثر ورسوخ مزید مضبوط کرلیا جو کہ نچلی سطح پر بااثر ثابت ہو سکتے تھے۔ان مذہبی انتہا پسند گروپوں کے کئی افراد کا تعلق مجرمانہ حرکتوں میں ملوث گروپوں سے تھا اور ان سماج دشمن کاروائیوں کے لئے ان کے تعلقات مقامی پولیس اور فوجی افسران کے ساتھ تھے۔اسطرح ریاست کی گرفت معاملات پر کمزور پڑتی چلی جارہی تھی۔ "پیشہ ورانہ" افسران کے سامنے ایک بہت مشکل درپیش تھی۔ مشرف نے جلد ہی صورتحال کو بہتر بنانے کیلئے اقدامات شروع کر دئے۔ ملک میں بڑھتی ہوئی قتل و غارت گری نے مشرف کو فوری اقدامات اٹھانے کے لئے موقع فراہم کر دیا۔اس نے جون ۲۰۰۱ میں " قومی سیرت کانفرنس" کے موقع پر علماء سے مخاطب ہوکر ان کی تنگ نظری اور ان کے اقدامات کی وجہ سے اسلام کی بین الاقوامی سطح پر ہونے والی بدنامی پر انہیں بڑے سخت الفاظ میں لعن طعن کیا۔انھوں نے ان سے سوال پوچھا کہ کیا اسلام ایسی فرقہ ورانہ قتل و غارت گری کی حمایت کرسکتا ہے اس سے علماء کو تنبیہ ہوئی کہ وہ قانون سے بالاتر نہیں اور انکے خلاف بھی کارروائی ہوسکتی ہے۔ یہ تقریر انتہائی ترش اور تلخ لہجے سے بھری ہوئی تھی۔وہ صرف ایک سال پہلے ایسی تقریر نہ کر سکتے لیکن اب وہ بڑی حد تک پر اعتماد تھے اور اس تنبیہ کے دو ماہ بعد ۱۴ اگست ۲۰۰۱ کو انھوں نے فرقہ ورانہ دہشت گردی میں ملوث ملک کی دونوں دو اہم تنظیموں لشکر جھنگوی اور سپاہ محمد پر پابندی عائد کرنے کا اعلان کیا۔لیکن یاد رکھئے یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب صدر بش دہشت گردی کے خلاف اپنی جنگ کا آغاز کر چکے تھے۔ جنرل مشرف کو اس بات کا یقین تھا کہ ان کی طرف سے انتہا پسندی کے خلاف اٹھائے گئے اقدامات سے امریکہ خوش ہوکر اس کی حمایت کردیگا جبکہ اس سے پہلے امریکہ مشرف کے ناقدین میں شامل تھا۔اسکے ساتھ مشرف کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ انکا اقتدار میں رہنے کے لئے امریکہ کی حمایت حاصل کرنا کس قدر ضروری تھا۔امریکی حمایت حاصل کرنے کے بعد ہی وہ اس قابل ہو سکے کہ ان فوجی افسران کے خلاف کوئی کارروائی کرسکیں جو کہ یا تو خود اس قسم کی سرگرمیوں میں ملوث تھے یا مذہبی انتہا پسندوں کو مدد فراہم کررہے تھے۔ پاکستان میں بیشتر لوگوں کا خیال ہے کہ جنرل مشرف نے ملک میں انتہا پسند گروہوں کے خلاف کاروائی امریکہ کی ہدایت پر شروع کی جو کہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ جنرل مشرف

کی انتہا پسند گروپوں کے خلاف کارروائی ۱۱ ستمبر کے واقعات سے قبل ہی شروع ہو چکی تھی۔ لیکن ہمیں یہ بات تسلیم کرنی چاہئے کہ انتہا پسندوں کے خلاف فیصلہ کن کارروائی یقیناً ۱۱ ستمبر کے واقعات کے بعد ہی شروع ہو سکی جب مشرف کو اس بات کا یقین ہو چلا کہ امریکہ انکے اقدامات کی ہر صورتحال میں حمایت جاری رکھے گا امریکہ کی حمایت سے ہی مشرف کئی طاقتور جنرلوں کو جن کا تعلق انتہا پسندوں کے ساتھ تھا انھیں ملازمت سے برطرف یا کنارہ کش کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ یہاں ہمارے سامنے ایک اہم مثال ایک انتہائی طاقتور جنرل محمود احمد کی ہے۔ جو کہ ISI کے ڈائیریکٹر جنرل کے طور پر کام کر رہے تھے اور ایک انتہائی طاقتور اور پُر عزم (ambitious) جنرل تھے ان کی طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۲۰۰۰ میں جب جنرل مشرف نے افغانستان کا دورہ کر کے مُلّا عمر کو اسامہ بن لادن کی حمایت سے دست بردار کرنے کا فیصلہ کیا تو جنرل محمود نے ان کی اس کوشش کو ناکام بنانے کیلئے ان کی جگہ خود افغانستان کا دورہ کیا اور طالبان کو اسامہ بن لادن سے قطع تعلق کرنے کے بجائے اس کی حمایت جاری رکھنے کا خفیہ اشارہ دیا۔ جنرل مشرف نے کشمیر، افغانستان اور دیگر جگہوں پر بنیاد پرستوں کے اسلامی جہاد کے نعرے کے مقابلے میں " پہلے پاکستان" کا نعرہ لگایا اور یہ نعرہ چل نکلا۔ جنرل مشرف نے مسلح مذہبی بنیاد پرست گروپوں پر پابندی عائد کرنے کی وضاحت کرتے ہوئے یہ کہا کہ یہ اقدام "ریاست کے اختیار کی بحالی" کے لئے نہایت ضروری ہے۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ فوج کے اختیار کی بحالی (Writ of the army) ہے۔

وقتی طور پر پیشہ ورانہ گروپ نے کچھ گرفت حاصل کر لی ہے لیکن اصل کام تو اب بھی شروع ہی ہونا ہے۔ لیکن گذشتہ دو دہائیوں سے زیادہ کے عرصے میں فوج اور سول سوسائٹی کے اندر سے مذہبی انتہا پسندی کے بڑھتے ہوئے اثرات کا خاتمہ فوری طور پر ممکن نہیں۔ سب سے زیادہ یہ کہ اب یہ کسی انفرادی شخص کے ذاتی اعتقادات کا سوال نہیں بلکہ جنرل ضیاء الحق کی مہربانی سے اسلامی بنیاد پرست بیوروکریسی، عدلیہ اور تعلیمی نظام سمیت تمام شعبوں میں سرایت کر چکے ہیں۔ ان تمام شعبوں سے انتہا پسندوں کے اثرات کا مکمل خاتمہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے جسکو اب تک صحیح طور پر مخاطب ہی نہیں کیا گیا۔ مسئلہ صرف کسی ایک شخص یا اسکے ذاتی خیالات کا نہیں بلکہ فوری نوعیت کا مسئلہ یہ ہے کہ شریعت عدالتوں کا خاتمہ کیا جائے جو کہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں بنائی گئیں اور

جن کا مقصد ملک کے قوانین کو شریعت کے اصولوں کے مطابق ڈھالنا تھا۔ دیکھا جائے تو شریعت عدالتوں کے ججوں نے اسلام کے نام پر قانون بنانے کے اختیارات حاصل کر لئے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ کسی کے سامنے جواب ہی نہیں۔ اس کی ایک مثال سپریم کورٹ کے شریعت بینچ کا وہ حالیہ فیصلہ ہے جس میں سود کے کاروبار کی کسی بھی صورت میں مکمل ممانعت کردی گئی۔ اگر اس پر عمل ہو جائے تو ملک کا اقتصادی نظام مکمل طور پر مفلوج ہو جائے۔ حکومت عدالت کے اس فیصلے پر کوئی جرأت مندانہ (courageous) قدم اٹھانے کی بجائے مختلف طریقوں سے مزید مہلت حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ جب کہ حقیقت یہ کہ حکومت کو اس مرحلے پر فوری طور پر شرعی عدالتوں کے خاتمے کا اعلان کرنا چاہئے جو کہ ہر صورت میں مکمل طور پر غیر جمہوری ہیں۔ یہ عدالتیں جمہوری مقننہ (legislagure) کی حدود میں داخل ہو کر قانون سازی کے عمل میں مصروف ہو گئی ہیں۔ ان تمام امور پر اب بھی بحث ومباحثہ کرنے کی ضرورت ہے اور حکومت کو ان معاملات پر اصولی اور مستحکم (firm) فیصلے کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ تمام اداروں کی از سر نو تعمیر اور ان کی جدید تقاضوں کی ضروریات کے مطابق تعلیم ایک حقیقی کام ہے جس پر کہ ابھی کام شروع کیا جانا باقی ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل ریٹائیرڈ طلعت محمود نے پیشہ ورانہ افسران کے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے یہ بات کہی ہے (Dawn, Jan 26) کہ اداروں میں اصلاح اور تبدیلی کا عمل اتنا آسان اور ہموار نہ ہوگا اور کئی گروہوں اور خاص طور پر اسٹیبلشمنٹ کے اندر سے ان تبدیلیوں کے خلاف شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے (واضح اشارہ فوج کی طرف ہے۔ حمزہ علوی) جنرل مشرف نے مردانہ وار آگے بڑھنے کی بجائے پسپائی کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ ہمیں ان کے الفاظ کے ذخیرے (vocabulary) میں کئی نئے الفاظ مثلاً انتہائی لبرل (ultra liberals) کے الفاظ ملیں گے جن کو وہ کوئی معنی نہیں دے سکتے۔ حالیہ دنوں میں کئی مواقعوں پر پسپائی کے بعد اسلامی بنیاد پرستوں کے لئے ان کی یہ باتیں دلفریب موسیقی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ ایک ثقافتی انقلاب کی شدید ضرورت ہے۔ مشرف کا کہنا ہے کہ وہ پاکستان کو ایک جدید اعتدال پسند مسلمان ریاست کے طور پر دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ اس ضمن میں اگر جنرل پرویز مشرف اور فوج کے دیگر افسران کا خیال ہے کہ معاشرے میں ترقی پسندی اور روشن خیال صرف بالائی احکامات کے ذریعے پیدا کی جاسکتی ہے تو یقیناً یہ لوگ بہت بڑی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ جبکہ درحقیقت اس موقع پر

آزادانہ اور کھلے عوامی مباحثوں اور آزادی اظہار کی شدید ضرورت ہے تاکہ تخلیقی اور جرأت مندانہ خیالات کو پنپنے کا موقع دیا جا سکے۔ آزادی کے وقت سے لے کر گذشتہ نصف صدی سے سنسر شپ اور قید و بند کی ثقافت کو نافذ رکھا گیا جس کا خاتمہ ضروری ہے۔ نئے خیالات سے درس و تدریس کی دنیا سے منسلک افراد، میڈیا اور پولیس کو بھی خدشات لاحق ہیں۔ ان تبدیلیوں سے سب سے بڑھ کر خدشہ ملک کی جامعات کے ان انتظامی سربراہان کو درپیش ہے جو صحیح یا غلط طور پر بہر حال ریاست کے اقدامات کو درست سمجھتے ہیں اور ہر صورت میں ان کے حمایتی رہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ نہیں جو کہ نئے خیالات کی حوصلہ افزائی کریں اور پرانے دقیانوسی خیالات کو للکارنے والے خیالات (ideas) کی حمایت کر سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کو ایک ایسے intellectual ماحول کی ضرورت ہے جو کہ نئے اور تخلیقی خیالات کی پرورش کر سکے۔ اس کے کچھ اثرات موجود ضرور ہیں۔ لیکن اس پر آگے چلنے کے لئے طویل سفر طے کرنا باقی ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ چیزیں سیاسی خلاء میں پروان نہیں چڑھ سکتیں اور نہ ہی یہ چیزیں بغیر تکلیف برداشت کئے اور بنا جدوجہد کے حاصل ہو سکتی ہیں۔

کشمیر:

مسئلہ کشمیر پاکستان اور انڈیا کے تعلقات کو بہتر بنانے میں سب سے اہم رکاوٹ ہے۔ یہ صحیح وقت ہے کہ دونوں ممالک اس بات کو تسلیم کر لیں کہ کشمیر کا مستقبل کشمیریوں کو ہی طے کرنا ہے۔ ۱۹۸۹ میں کشمیر کی انتفادہ (Intafada) شروع ہونے کے بعد اس کی حقیقت کے متعلق پاکستان میں بھی آگہی بڑھتی جا رہی ہے۔ پاکستان کے لوگ کشمیریوں کے حق خود ارادیت کی بڑی شدت سے حمایت کرتے ہیں۔ پاکستان کی کوئی حکومت اس سے دست بردار نہیں ہو سکتی۔ جنرل مشرف نے بھی اس کی حمایت کا اعلان کیا ہے لیکن اس طریقہ کار کی مزاحمت کرتے ہوئے جو کہ جہادی گروپوں نے مقبوضہ کشمیر میں جدوجہد کے لئے اپنایا ہے۔ انھوں نئے "دہشتگردی" اور آزادی کی قوتوں کے درمیان فرق کو سمجھتے ہوئے اور کشمیر کی جدوجہد کو درست قرار دیتے ہوئے اس کی حمایت کا اعلان کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے اس جدوجہد میں پاکستان سے تعلق رکھنے والے انتہا پسند گروہوں کے کسی کردار کو مسترد کر دیا ہے۔ ۱۹۸۹ میں جب کشمیر کی انتفادہ intifada

شروع ہوئی تو اس وقت کے فوج کے سربراہ جنرل اسلم بیگ نے ISI کا کشمیری سیل قائم کر دیا جو کہ کشمیری جہادی گروپوں کی سرگرمیوں کے درمیان رابطے اور کنٹرول کا کام کرتا تھا جس کو مشرف نے بند کر دیا۔ کشمیر میں سرگرم عمل پاکستان سے تعلق رکھنے والے گروپوں پر تنقید کرتے ہوئے مشرف نے کہا کہ یہ لوگ طالبان طرز کے انتہا پسند اسلام کو کشمیریوں پر تھوپنا چاہتے ہیں جو کہ کشمیریوں کو ان سے بیگانہ / متنفر کر رہا ہے۔ دوسرا یہ کہ مشرف نے اس بات کو بھی تسلیم کر لیا (زمینی حقائق کو دیکھتے ہوئے) کہ کشمیر کے مسئلے کا کوئی فوجی حل ممکن نہیں اسے ہر صورت میں سیاسی جدوجہد سے حل ہونا چاہئے اسکا کہنا ہے کہ پاکستان کو کشمیریوں کے حق خود ارادیت کے لئے سیاسی اور سفارتی مدد کرنی چاہئے اور اس بات کیلئے ضرور کوشش کرنی چاہئے جس کے تحت کشمیر کے مسئلے پر اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل درآمد کیلئے حمایت اور بین الاقوامی ثالثی حاصل کر لی جاسکے۔ آل پارٹیز حریت کانفرنس جو کہ ۲۳ مختلف الخیال پارٹیوں کا اتحاد ہے اس کے صدر عبدالغنی بٹ نے اس اعلان کو خوش آئند قرار دیتے ہوئے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ اس جدوجہد کو سیاسی عمل کے ذریعے آگے بڑھایا جائے۔

انڈیا کی طرف سے جنگ کی دھمکی:

دسمبر ۲۰۰۲ کے وسط میں پاکستان کو ہندوستان کی طرف سے جنگ کے خطرے کا سامنا تھا جس کی وجہ جہادی دہشتگردوں کی طرف سے ہندوستانی کے پارلیمان پر ۱۳ دسمبر کو ہونے والا حملہ تھا۔ ہندوستان نے فوری طور پر اس حملے کے لئے پاکستان کی ISI اور پاکستان میں سرگرم دو تنظیموں جیش محمد اور لشکر طیبہ کو اس حملے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ روایت کے مطابق اس دونوں جہادی گروپوں کے سینکڑوں کارکنوں اور رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا۔ جبکہ دوسری طرف حکومت پاکستان نے ان گرفتاریوں کے دہلی حملوں سے متعلق ہونے سے انکار بھی کیا۔ یہ حملہ وہ آخری چیز تھی جو مشرف حکومت شاید چاہتی تھی حالانکہ پاکستان اس ڈرامے سے کچھ حاصل نہیں کر سکتا تھا اور اسکے نتیجے میں اس کے اپنے نقصان کا زیادہ اندیشہ تھا۔ پاکستان کی سرحدوں پر انڈیا کی فوجوں کی اتنی بڑی نقل و حرکت کی حالیہ دنوں میں کوئی نظیر نہیں ملتی تھی۔ ۱۴ جنوری ۲۰۰۳ کی واشنگٹن ٹائم کی ایک رپورٹ کے مطابق جو کہ امریکہ کے خفیہ ذرائع سے اکٹھا کی گئی تھی۔ اسکے مطابق ہندوستان کی ۹۰ فیصد فوج

پاکستان کی سرحد پر لگادی گئی تھی۔ انڈیا کے پاس پاکستان کے مقابلے میں ایک قدرے بڑی فوج ہے جو کہ بہتر اسلحہ سے لیس ہے اور اسکے پاس موجود نیوکلیائی ہتھیاروں کی صلاحیت پاکستان سے زیادہ بہتر ہے۔ پاکستان کے سامنے اس تضاد (conflict) کے چند ممکنہ نتائج outcome موجود ہیں۔ مشرف سرحدوں پر بڑھتے ہوئے فوجی دباؤ کو کم کرنے اور انھیں امن کے وقت کی پوزیشن پر واپس لے جانے کے لئے اپلیں کر رہے ہیں تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ جنگ میں بھارت کے لئے کامیابی حاصل کرنا اتنا سہل نہ ہو سکے گا چاہے اسکا آخری نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو۔ پاکستانی فوج اس بات کی صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ اس لڑائی میں مقابل کو بھاری نقصان پہنچائے۔ پاکستان اور بھارت کے لئے جنگ آخری راستہ ہوگا اسکے نتائج دونوں ملکوں کے لئے تباہ کن ہو سکتے ہیں۔

اس مضمون نگار کے لئے جس نے اپنی زندگی کا اچھا اور بیشتر وقت دونوں ممالک کے درمیان دوستی کو فروغ دینے پر صرف کیا ہے اسکے لئے موجودہ ہندو مذہبی انتہا پسند جماعت BJP کی حکومت کی طرف سے مشرف حکومت کی امن کو بحال کرنے کی کوششوں (جنہیں امریکہ کی حمایت بھی حاصل ہے) ان کو ٹھکرائے جانے پر ایک شدید دکھ اور پریشانی لاحق ہے۔ ہندوستان کی پارلیمان پر جہادیوں کے حملوں کی مشرف نے بلا کسی تامل کے فوری مذمت کی۔ انھوں نے انڈین حکومت کو اس معاملے میں تفتیش کے لئے مشترکہ طریقہ اپنانے کے لئے پیشکش کی تاکہ اس کارروائی کے مرتکب افراد کی نشاندہی کے بعد انھیں کیفر کردار تک پہنچایا جا سکے۔ بھارت نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ پاکستان نے بعد ازاں انڈیا سے اس بات کی اپیل کی کہ کم از کم اس حملے کے بارے میں شواہد مہیا کئے جائیں تاکہ اس پر مزید کاروائی کی جا سکے۔ پاکستان کو ۲۰ افراد کی ایک فہرست پیش کردی گئی جس میں زیادہ تر افراد بھارتی شہریت رکھتے تھے۔ بھارت انکی حوالگی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ مشرف نے اس موقع پر یہ کہا کہ پاکستان نے کسی بھارتی شہری کو پناہ نہیں دے رکھی۔ جہاں تک اس فہرست میں کسی پاکستانی باشندے کے نام کا شامل ہونا ہے۔ پاکستان اسے کسی صورت میں بھی کسی دوسرے ملک کے حوالے نہیں کرے گا۔ اگر ان میں سے کسی کے خلاف بھی کارروائی کرنا ہوئی تو وہ صرف پاکستان کے اپنے قوانین کے مطابق ہی کی جا سکے گی۔ انڈیا کو مشرف حکومت کی طرف سے کشمیر میں سرگرم عمل پاکستان سے تعلق رکھنے والے جہادی تنظیموں کے خلاف اٹھائے گئے اقدامات پر یقین رکھنا چاہیے۔

مشرف نے اپنی ۱۲ جنوری (۲۰۰۲) کی تقریر میں پاکستان میں بنیاد پرستوں اور جہادی

گروپوں کے خلاف کارروائی کے متعلق تفصیلات بتائیں۔ پانچ دیگر اسلامی بنیاد پرست اور جہادی گروہ پر پابندی عائد کرنے کا اعلان کیا گیا اسی عرصے میں بڑے پیانے پر مذہبی بنیاد پرست، لیڈروں اور کارکنوں کی گرفتاری کے لئے چھاپے مارے گئے اور اسکے نتیجے میں ایک اندازے کے مطابق ۲۰۰۰ سے زائد افراد کو گرفتار کرنے کے ساتھ ہی جہادی گروپوں کے پاس موجود اسلحے کی فوری ضبطگی کے لئے احکامات جاری کئے گئے۔ پاکستان کے ان اقدامات کو بھارت کے حزب اختلاف کی دونوں بڑی پارٹیوں، کانگریس اور دونوں کیمونسٹ پارٹیوں نے فراخدلانہ طور پر قابل ستائش قرار دیا۔ حسب روایت حکمران BJP جماعت کا رویہ سرد مہری کا تھا اور انھوں نے تواتر کے ساتھ یہ بیانات دینا شروع کئے کہ وہ صرف الفاظ پر یقین نہیں کرتے بلکہ حقیقی معنوں میں کاروائی ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس صورتحال میں امریکی وزیر خارجہ کولن پاول کو بی جے پی کو دور اندیشی اور تحمل کی پالیسی اپنانے کے لئے قائل کرنے کی غرض سے تین روزہ دورہ کرنا پڑا۔ اپنے دورے میں انہوں نے بی جے پی کی قیادت کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ زمینی حقائق کو سمجھتے ہوئے اپنے بیانوں میں ذرا نرم اور دھیما لہجہ اختیار کریں۔ امریکی وزیر خارجہ کے ساتھ ان کے دورے کے اختتام پر ایک مشترکہ پریس کانفرنس کرتے ہوئے بھارتی وزیر خارجہ خارجہ جسونت سنگھ نے جنرل مشرف کی ۱۲ جنوری کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے بھارت کی طرف سے انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں مکمل تعاون کے عزم کا اظہار کیا۔ لیکن اگلے ہی دن بھارتی وزیر خارجہ اپنے اصل روپ میں سامنے آئے۔ مشرف کی تقریر کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود انھوں نے اس بات کو دہرایا کہ "صرف تقریر کافی نہیں"۔ انھوں نے کہا کہ بھارت پاکستانی سرحد سے فوجیں اس وقت تک واپس نہیں لے جائے گا جب تک وہ لوگ بھارت کے حوالے نہ کر دیئے جائیں جن کی فہرست پاکستان کو مہیا کی گئی ہے۔ اسکے جواب میں جنرل مشرف نے اپنی طرف سے مذہبی انتہا پرست گروہوں کے خلاف اٹھائے گئے اقدامات اور بھارت کے تحفظات کے جواب میں یہ کہا کہ کسی دوسرے ملک کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ہمارے اقدامات پر فیصلہ صادر کرے۔ پاکستان جو بھی اقدامات اٹھا رہا ہے ایک طرح سے درحقیقت اپنے ملک سے دہشت گردی اور مذہبی انتہا پسندی کو ختم کرنے اور اپنے معاشرے کی اصطلاح کو درست کرنے کے لئے کر رہا ہے نہ کہ کسی اور کو خوش کرنے کے لئے۔ جنرل مشرف کا رویہ بڑی حد تک مفاہمانہ بھی تھا۔

انھوں نے کہا کہ ہمیں ان اقدامات کے نتائج کے سامنے آنے کے لئے حوصلہ (Patience) رکھنے کی ضرورت ہے۔سخت گیر بھارتی موقف کی وضاحت کرتے ہوئے جنرل مشرف نے کہا کہ "بھارتی جارحانہ رویئے کے پس پشت عوامل کو اگر غور سے دیکھا جائے۔تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ چونکہ BJP حکومت مختلف النوع ۲۰ جماعتوں کا اتحاد ہے۔ جنکے خیالات یقیناً ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور انکو ایک بات پر راضی ہونے کے لئے نسبتاً زیادہ وقت درکار ہوتا" اسی لئے مسٹر ایڈوانی نے اس بات کا اشارہ دیا ہے کہ سرحدوں سے ہندوستانی فوج کی واپسی فروری ۲۰۰۳ کے اختتامی ایام میں ہونے والے انتخابات سے قبل ممکن نہیں۔لیکن انھوں نے یہ ضرور کہا کہ جنگ نہیں ہوگی۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان موجودہ تصادم ماضی کے حالات سے ذرا مختلف صورت میں نمودار ہوا ہے۔حالیہ برسوں میں ایک وقت میں بھارت کی قابل فخر سیکیولرزم پر انتہا پرست نظریات پوری طرح حاوی ہو چکے ہیں۔ایک بنیاد پرست ہندو ہندواتہ کے نظریات نے جو کہ عیسائیوں اور مسلمان دونوں کے خلاف ہیں انھوں نے ہندوستان کو اپنی گرفت میں لے لیا۔دونوں اقلیت گروہوں کے خلاف انتہا پسندوں نے ظلم ڈھائے ہیں۔ پاکستان میں بیشتر افراد کا خیال یہ ہے کہ بھارتی وزیر اعظم واجپائی بذات خود جنگی جنون نہیں رکھتے۔لیکن وہ اپنے دیگر سنیئر رفقاء بالشمول انتہا پرست وزیر داخلہ لال کرشنا ایڈوانی اور شاونسٹ وزیر دفاع جارج فرنانڈس شامل ہیں، انکے زیر اثر اور اسکے ساتھ ہی ہندو بنیاد پرستوں کی طرف سے سیاسی دباؤ کے باعث بھی جن کا خیال ہے کہ پاکستان کو "سبق سکھایا جائے" وہ اسے انتہا پسندوں کے ہاتھوں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ایک خیال یہ بھی ہے کہ ایڈوانی نے اس مسئلے پر انتہائی سخت رویہ شاید اسلئے بھی اپنایا ہے کہ وہ عمر رسیدہ اور بیمار وزیر اعظم واجپائی کی جگہ مستقبل میں اپنے آپ کو نعم البدل کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ مستقبل کے بارے میں اتنے ambitious ہیں تو انہیں یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ انکے انتہائی بنیاد پرستانہ نظریات بیس پارٹیوں کے مشکل اتحاد کو اکٹھا چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔لگتا ہے کہ پاکستان کے ساتھ موجودہ جنگی جنون میں BJP کا سخت رویہ فروری ۲۰۰۳ میں بھارت کی سب سے بڑی ریاست UP میں ہونے والے انتخابات ہیں۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ ان انتخابات کے نتائج نہ صرف اس ریاست میں بلکہ پورے ملک میں BJP کے مستقبل کا فیصلہ کریں گے۔اسلئے اس میں اتنی حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ BJP اپنی کامیابی کی راہ

میں حائل تمام رکاوٹیں عبور کر کے اپنی کامیابی کو یقینی بنانا چاہتی ہے چاہے اس میں پاکستان کے خلاف جنگی جنون کو ہوا دینا ہی ہو۔ ان مقامی اور عبوری عناصر کے علاوہ ایک اور طویل المیعاد عنصر جو کہ بھارت کی عالمی پالیسیوں کو بنانے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے وہ بھارت کے وہ عزائم ہیں جس کے تحت وہ عالمی طاقت کے طور پر اپنے آپ کو منوانے کا خواہشمند ہے۔ علاقے کی سب سے بڑی اقتصادی اور فوجی طاقت ہونے کی وجہ سے اب انڈیا اس بات کا خواہشمند ہے کہ وہ اپنی طاقت اور اثر کو پورے ایشیا خاص طور پر مشرق وسطیٰ تک وسعت دے جس کے لئے وہ اسرائیل کے ساتھ نئے اتحاد بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسکے ساتھ ہی بھارت اقوام متحدہ کی سلامتی کاؤنسل کی مستقل رکنیت کا بھی خواہش مند ہے اور اس کے لئے صدر بش اور برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر نے بھی اسے اپنی حمایت کا یقین دلایا ہے۔ امریکہ کی بھی ایک خواہش ہے کہ بھارت مشرق وسطیٰ اور جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا میں ایک کلیدی کردار ادا کرے یقیناً ان کی اس خواہش کے پس پشت چین کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ کو محدود کرنا بھی شامل ہوسکتا ہے بھارت اپنے عالمی اور بین الاقوامی عزائم کی تکمیل کے سلسلے میں اسرائیل سے تعلقات بہتر بنانے کے لئے کئی اقدامات کر رہا ہے اور خاص طور پر دیگر امور کے ساتھ دفاعی تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس کے نتیجے میں اسرائیل بھارت کو انتہائی جدید فوجی ٹیکنالوجی فراہم کریگا۔ ان کو مزید آگے بڑھانے کے لئے صرف نومبر ۲۰۰۱ میں اسرائیل کے ۳ سرکاری وفود نے بھارت کے دورے کئے۔ پہلا دورہ اراکین پارلیمنٹ پر مشتمل تھا جبکہ دوسرا وفد وزارت خارجہ اور سب سے اہم تیسرا وفد وہ تھا جو کہ وزارت دفاع کی نمائندگی کر رہا تھا۔ ان دوڑوں کے بعد جنوری ۲۰۰۲ میں اسرائیل کے وزیر خارجہ شمون پیرس نے بھارت کا تین روزہ دورہ کیا۔ جس میں یہ طے پایا کہ اسرائیل بھارت کو انتہائی جدید جنگی ہتھیار اور فوجی ٹیکنالوجی فراہم کرے گا۔ اس میں ایک اہم جنگی ہتھیار فیلکن (phylcon) جنگی جہاز بھی شامل ہے جو کہ جنگ کے متعلق قبل از وقت اطلاعات فراہم کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ قبل ازیں امریکہ نے اسرائیل کو یہ جنگی جہاز کسی تیسرے ملک کو فروخت کرنے کی اجازت نہیں دی تھی لیکن اب اسے یہ طیارے بھارت کو فروخت کرنے کی خصوصی اجازت دیدی گئی ہے۔ بھارت کو پہلے ہی اپنے دیگر ہمسائیوں کے مقابل جنگی برتری حاصل ہے۔ اس نئے دیئے جانے والے اسلحے کے بعد اب یہ سوالات اٹھتے ہیں کہ جنگی آلات کے

حصول کے لئے بھارت اتنی زیادہ سرمایہ کاری کیوں کر رہا ہے۔اس موقع پر ہمیں بھارت کے وزیر دفاع جارج فرنانڈس کے مئی ۱۹۹۸ میں بھارت کے ایٹمی دھماکوں کے موقع پر دیا جانے والا بیان اہم سراغ فراہم کرتا ہے۔جس میں انھوں نے کہا تھا کہ بھارت کے ایٹمی ہتھیار اور ان کا ترسیلی نظام دراصل چین کے خلاف بنایا جا رہا ہے۔

پاکستان میں فوج اور جمہوریت:

پاکستان میں درحقیقت فوج نے ہی ہمیشہ اقتدار پر قبضہ جمائے رکھا ہے چاہے اس وقت سویلین حکومت ہی برسر اقتدار کیوں نہ ہو۔ پاکستان میں آنے والے تمام "جمہوری" سربراہان نے اقتدار کے لئے فوج کی حمایت پر ہی انحصار کیا اور اس کی منظوری سے ہی وہ حکومت میں رہ سکے۔فوج کو پاکستان کی ریاستی پالیسیوں میں کلیدی حیثیت حاصل ہو چکا ہے۔اس بات کو فوج کے ایک سینئر جنرل طلعت مسعود نے ان الفاظ میں تسلیم کیا ہے کہ ماضی میں داخلی اور بیرونی دونوں سطح پر ہماری پالیسیاں ناکامی کا شکار رہیں جسکی ایک وجہ ان معاملات میں فوج کو کردار ادا کرنا پڑا۔ فوج کے اقتدار پر قبضے کی مضبوط گرفت کا اندازہ اس وقت ہوا جب ایک انتہائی دائیں بازو کے وزیراعظم نواز شریف نے ملک میں فوج کی بالادستی اور خودمختاری کو ختم کرنے کے لئے مشرف کو ہٹا کر ان کی جگہ اپنے نامزد شخص کو فوج کا سربراہ بنانے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں نواز شریف کو فوری طور پر ایک ملٹری بغاوت کے نتیجے میں ہٹا دیا گیا اور فوج کی یہ بغاوت خود اپنے ادارے کی خودمختاری کو بچانے کے لئے تھی حالانکہ اس وقت نواز شریف کو امریکہ کی بھرپور اور مکمل حمایت حاصل تھی۔امریکہ کی حمایت اس کو اقتدار سے نکالے جانے سے نہ بچا سکی۔امریکہ نے اس فوجی بغاوت پر غصے میں آ کر بین الاقوامی سطح پر پاکستان پر یہ دباؤ ڈالنے کی کوشش کی کہ جمہوریت فوری بحالی کی جائے۔مشرف اور فوج کو اس بیرونی دباؤ کے باعث باحالت مجبوری اس کے لئے وعدہ کرنا پڑا۔سپریم کورٹ آف پاکستان جس نے ابتدائی طور پر جنرل مشرف کی بغاوت کو مشروط طور پر جائز قرار دیا تھا۔ بعدازاں فوج کو اکتوبر ۲۰۰۲ تک ملک میں پارلیمانی حکومت بحال کرنے کی ہدایت کی۔مشرف یہ کام کرنے کے لئے راضی ہو گئے۔اسی موقعے پر یہ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ ان معاملات پر عمل درآمد کس طرح ہوگا۔اس حالت میں جب مشرف نے اپنے آپ کو کم از کم

(پانچ سال کے لئے) صدر مقرر (appoint) کر دیا ہے اور یہ بات کوئی نیک شگون نہیں۔ آئین کو بھی بحال کیا جانا ہے لیکن اب یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ کس صورت میں کیا جائیگا۔ الیکشن کا وعدہ کر دیا گیا ہے لیکن فوج نے سیاستدانوں کے لئے اپنی نفرت کسی سے پوشیدہ نہیں رکھی۔ مذہبی جماعتیں کوئی بڑا خطرہ نہیں ہوں گی جو کہ سارے منظر میں کہیں نہیں ہوں گی۔ ماضی میں یہ دو فیصد سے زیادہ ووٹ حاصل نہیں کر سکیں اور ان انتخابات میں بھی ان سے کسی بہتر کارکردگی کی امید نہیں لگائی جاسکتی۔ دونوں بڑی سیاسی جماعتیں بھی اس حکومت کو چیلنج نہیں دے سکیں گی۔ مسلم لیگ نے بڑی کامیابی سے اپنے مدمقابل پارٹیوں کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے اور PPP اپنی قیادت کی جلاوطنی کی وجہ سے نیم دلی کا شکار ہے۔ مشرف کے ایک وزیر نے وزارت سے استعفیٰ دیکر اپنی نئی سیاسی جماعت کی بنیاد ڈالی ہے۔* اشارے یہی ہیں کہ نیا سسٹم دو عناصر پر مشتمل ہوگا اس میں سے ایک معذور اور مفلوج ہوگا۔ نئے نظام کا ایک حصہ مقامی حکومت کے نظام کا ہوگا جس کے انتخابات گذشتہ سال منعقد کئے گئے نظام کا یہ حصہ جنرل ایوب خان کے بدنام زمانہ بنیادی جمہوریت کے طرز پر ہوگا جو کہ بیوروکریسی کے کنٹرول اور اشاروں پر چلنے والا تھا جبکہ اس نظام کا دوسرا حصہ لولی لنگڑی بے اختیار پارلیمنٹ ہوگی۔ جو کہ بین الاقوامی دباؤ کے زیر اثر کی جائے گی۔ ہمیں انتظار کرنا ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ چیزیں کس طرح آگے بڑھتی ہیں۔

---

* مصنف کا اشارہ ائیر مارشل ریٹائرڈ اصغر خان کے بیٹے عمر اصغر خان ہے جو کہ مشرف حکومت میں وزارت بلدیات میں وفاقی وزیر رہے اور بعد ازاں علیحدہ سیاسی جماعت بنائی لیکن کچھ ہی عرصے بعد کراچی میں اپنے سسرال میں مردہ پائے گئے جس کے متعلق کئی باتیں گردش کر رہی ہیں۔

پاکستان اورامریکہ کےفوجی اتحاد کی ابتداءاوراہمیت

The Origins of and Significance of Pakistan- US Military Alliance

پاکستان کے اور افغانستان کے ساتھ تنازعات اور تصادم عمومی طور پر اور ہندوستان کے ساتھ کشمیراور دریائی پانیوں کی تقسیم جیسے مسائل پر بالخصوص آزادی کے فورابعد پاکستان کی بننے والی خارجہ پالیسی کا بلاشبہ محورومرکز تھے۔ یہ تنازعات اشکال بدل کر برسوں بعد بھی بدستوراپنی جگہ موجود ہیں۔لیکن پاکستان کی خارجہ پالیسی کا مطالعہ کرتے ہوئے عمومی طور پرایک عام غلط فہمی یہ کی جاتی ہے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کواسکے ہمسایوں سے تنازعات کے تناظر میں انتہائی محدود زاویئے سے دیکھا جاتا ہے، جبکہ اگر دیکھا جائے تو ۵۰ کی دہائی کے وسط میں مشرق وسطی میں بڑھتے ہوئے تنازعات اورمغربی طاقتوں کی مستقبل کے لئےفوجی اور دفاعی منصوبہ بندی نے پاکستان کی خارجہ پالیسی میں بڑااہم کردارادا کیا۔ ۱۹۵۰ کی دہائی کے اوائل میں پاکستان کے امریکہ سے تعلقات کےایک نئے باب کا آغاز ہوا جس کا اختتام ایک وسیع فوجی اتحاد پر ہوا۔

فوجی اتحاد کے مقاصد:

ایک عمومی تاثر یہ ہے کہ پاکستان نے امریکہ سے تعلقات درحقیقت ہندوستان سے اپنے دفاع کو مستحکم کرنے کے لئے قائم کیے۔ ہندوستان کے قوم پرست محققوں اور سیاست دانوں نے پاکستان اورامریکہ کے اتحاد کواسی تناظر میں پیش کیا ہے جبکہ دوسری طرف پاکستان کے حکمرانوں

نے بھی امریکہ سے اپنے تعلقات کی توجیہہ کے لئے اسی سبب کو جائز قرار دیا انکے برعکس امریکہ کے سیاست دانوں کا ان تعلقات کے متعلق ایک منفرد نقطۂ نظر تھا۔ انکے خیال میں امریکہ پاکستان اتحاد کی صورت میں پاکستان کو جنوبی ایشیاء میں سوویت یونین کی وسعت پسندی کے عزائم کو روکنے میں پہلی دفاعی لائن کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ یہ خیال مک کراتھ (Mc Carthyte) کے سرد جنگ کے دوران امریکہ کی بنائی جانیوالی خارجہ پالیسی کی روح کے عین مطابق تھا اور اسی خیال کے باعث اس اتحاد کو امریکہ میں جائز اور قانونی قرار دیا گیا۔ امریکہ نے پاکستان سے اتحاد کرنے کے دوران کے خدشات کو بھی مدنظر رکھا۔ اگر چہ پاکستان نے امریکہ سے اتحاد ہندوستان کے مقابلے میں اپنے دفاع کو مضبوط کرنے کے لئے کیا تھا لیکن تنقید نگاروں کا خیال ہے کہ اس اتحاد کا پاکستان کو ہندوستان کے ساتھ ہونے والی جنگوں میں کوئی خاص فائدہ نہ ہوا جس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۷۱ اور ۱۹٦۵ کی دونوں جنگوں میں پاکستان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا جبکہ حقیقت یہ ہے امریکہ ہندوستان کو مسلسل اس بات کی یقین دہانی کراتا رہا کہ اس نئے بننے والے اتحاد سے ہندوستان کو کسی قسم کا خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ امریکی انتظامیہ نے اس بات کو خصوصی طور پر یقینی بنایا کہ پاکستان کو مہیا کیئے جانے والا اسلحہ کسی بھی طرح ہندوستان کے خلاف استعمال نہ ہو۔ اس تحقیقی مقالے کا اصل مقصد اس معاہدے کے ان پوشیدہ اور حقیقی پہلوؤں کو عیاں کرنا ہے جو کہ اب تک صرف اس لئے پوشیدہ رہے کیونکہ عام تصور یہ ہے کہ پاکستان اس معاہدے میں ہندوستان سے اپنے دفاع کو مستحکم بنانے کے لئے شریک ہوا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس اتحاد کی وجہ سے پاکستان امریکہ کا دست نگر (Protege) پاکستان اور امریکہ کے تعلقات کے بارے میں روایتی دانشمندی یہ بتاتی ہے کہ پاکستان کے بننے کے ساتھ ہی پاکستان کے حکمران اقتصادی اور فوجی امداد کے حصول کے لئے امریکہ کے آگے بھیک مانگتے ہوئے نظر آئے اور اس وقت سے لیکر آج تک ان تعلقات میں بنیادی طور پر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس مد میں ایک اہم کام Venkataraman کی ۱۹۸۴ میں شائع ہونے والی کتاب American Role in Pakistan ہے جس میں پاکستان اور امریکہ کے تعلقات کی مندرجہ بالا دونوں توجیہات کو بیان کیا گیا ہے۔ پاکستان پر یہ بڑا اہم اور پُر اثر تحقیقی کام سمجھا گیا۔ اس کی ظاہری طور پر وجہ یہ ہے کہ یہ کتاب پاکستان کے آنے والے تمام حکمرانوں کی اس رضامندی کو عیاں کرتی ہے جو کہ انھوں نے امریکہ کے ساتھ اپنے

تعلقات بحال رکھنے کے لئے دکھائی۔ Venkatarama.. کا خیال ہے کہ امریکہ کو پاکستان سے ایک ریاست (client state) جیسے تعلقات بحال رکھنے کے لئے کوئی دباؤ ڈالنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اگر ہم اس بات کو من وعن تسلیم کرلیں تو پاکستان کی سیاست میں ۱۹۵۰ کی دہائی میں ہونے والی تمام ڈرامائی تبدیلیوں پر پردہ پڑارہ جائے گا، جو کہ درحقیقت ان امریکی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اس ملک میں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اہم ہے کہ Venkataraman کی کتاب کو بڑی حد تک قابل اعتماد سمجھا جاسکتا ہے کیونکہ یہ کتاب واشنگٹن میں اہم تاریخی دستاویزات (Archival Mererial) سے حاصل ہونے والی معلومات پر مشتمل ہے۔ لیکن قابل افسوس بات یہ ہے کہ ان کی تحقیق بڑی حد تک منتخب (selective) اور جانب دارانہ ہے جو اس کے اپنے ذاتی تعصبات پر بھی مشتمل ہے مزید یہ ہے کہ Venkataraman کو اس علاقے میں امریکہ کے فوجی اور تزویراتی Strategic مفادات کے متعلق کوئی خاص معلومات حاصل نہ تھی اور مزید یہ کہ امریکہ کی خارجہ پالیسی میں پاکستان کی مختلف اوقات میں کم اور زیادہ ہوتی ہوئی اہمیت کے بارے میں بھی خدوخال واضح نہ تھے۔ علاوہ ازیں یہ کہ Venkatraman کا یہ کام ایک ہندوستانی قوم پرست نقطۂ نظر کا شاہکار ہے۔ یہ کام اس خواہش کا بھی عکاس ہے جو یہ بات ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ پاکستان کی سیاسی قیادت اور حکمران اور روز اول سے ہی امریکہ کی تابعداری کرنے کے لئے تیار تھے اور اس علاقے میں امریکہ کی پالیسیوں کو آگے بڑھانے میں آلہ کار ثابت ہوئے۔ Venkatraman اپنی اس تحریر میں پاکستان کے حکمرانوں کی امریکہ سے اقتصادی اور فوجی امداد کے لئے بے بسی، بے چارگی اور بے صبری کا مذاق اڑاتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں اور اس بات سے بھی لطف اندوز ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ کس طرح امریکی انتظامیہ کے اہلکار پاکستان کی عرضیوں اور درخواستوں کو دھتکارتے رہے۔ اور پھر ایک قابل اعتراض قومی غیرت (National Pride) کے تصور کے تحت وہ یہ بات کرتے ہیں کہ امریکہ نے اس علاقے کی سفارتکاری میں ہندوستان کو کس قدر اہمیت دینا شروع کی۔ وہ لکھتے ہیں کہ "امریکہ نے اس علاقے میں چین اور سوویت یونین کے کردار کو محدود رکھنے کے لئے ہندوستان کو واضح طور پر اہمیت دی اور اسی مقصد کے پیش نظر امریکی حکومت نے ہندوستان کے وزیراعظم نہرو کو امریکہ کے دورے کی سرکاری سطح پر دعوت دی جبکہ

پاکستان کے وزیراعظم کو دعوت دینے میں کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا"۔ یہ بات انتہائی بچکانہ لگتی ہے کہ امریکہ کے ہندوستان کے لئے سرپرستانہ (patronizing) رویے میں فخر کا کوئی پہلو تلاش کیا جائے۔ ہندوستان کو اہمیت دینے کے پس پشت بھی امریکہ درحقیقت اس علاقے میں اپنے مفادات کے حصول کے لئے کوشاں تھا۔ امریکہ کے پاکستان اور ہندوستان کے ساتھ قابل تفریق تعلقات کو دیکھتے ہوئے Venkatraman کو امریکی خارجہ پالیسی کا مزید گہرائی سے مطالعہ کرنا پڑا جس کے باعث اسے اس خطے میں امریکہ کے اصل مفادات کا اندازہ ہونا شروع ہوا اور یہ بات ۱۹۴۹ میں ہوئی۔ لیکن بہت جلد اس خطے میں آنے والی تبدیلیوں کے باعث امریکی ترجیحات کی کئی اہم تبدیلیاں فوری طور پر نظر آنا شروع ہوگئیں اور اس کے نتیجے میں امریکہ کو ہندوستان کی ناراضگی مول لیتے ہوئے پاکستان سے فوجی اتحاد قائم کرنا پڑا۔ یہ سوال بڑا اہم ہے کہ اس علاقے میں امریکہ کی ترجیحات میں انتہائی اہم اور بنیادی تبدیلیاں کیوں ہوئیں؟ کیا اس کے پس پشت پاکستان کی سفارتکاری کی دانشمندی تھی؟ اور اس اتحاد کے نتیجے میں امریکہ کو کیا فائدے پہنچے؟ امریکہ نے پاکستان کو کیا دیا؟ اس علاقے میں امریکہ نے پاکستان اور ہندوستان سے تعلقات میں تبدیلی کے پس پشت اپنے کونسے مفادات کی جمع تفریق (calculations) کی؟ Venkatraman ان سوالات پر زیادہ غور نہیں کرتے اور نہ ہی دیگر دوسرے دانشور بھی پاکستان کی خارجہ پالیسی کو بیان کرتے ہوئے ان باتوں کو زیرغور لاتے ہیں۔ اکثر دانشور ۱۹۵۰ کی دہائی میں پاکستان اور امریکہ کے بڑھتے ہوئے فوجی اتحاد کے پس پشت اصل مقاصد کو سمجھے بغیر انھیں جاری تعلقات کی مزید توسیع سے تعبیر کررہے تھے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۵۰ کی دہائی میں اس علاقے میں بڑی اہم تبدیلی رونما ہوئی جس کے باعث اس علاقے کے بارے میں امریکہ کو اپنی فوجی حکمت عمل میں بڑی بنیادی تبدیلیاں کرنا پڑیں۔ یہ وہ مجبوریاں تھیں جس کی وجہ سے امریکہ کو مشرق وسطی کے بارے میں اپنی نئی حکمت عملی کے لئے پاکستان کو کلیدی مقام دینا پڑا۔ پاکستان اور امریکہ کے تعلقات میں ابتدائی طور پر سردمہری اور بعدازاں گرم جوشی اور بہتری کو ہم اس وقت تک کلی طور پر سمجھ نہیں سکتے جب تک کہ ہم ان وجوہات کا جائزہ نہ لیں جو اس علاقے میں بڑی تبدیلی کا باعث بن رہی تھیں اور علاقے میں طاقت کے توازن میں تبدیلی کا باعث بن رہی تھیں۔ یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ ان تعلقات میں بہتری کی وجہ یہ نہیں تھی کہ

پاکستان نے اس ضمن میں کاوشیں کی تھیں جو کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے اور ایوب خان اس بات کا پروپیگنڈہ بھی کرتے رہے کہ وہ امریکہ پاکستان تعلقات کے اتحاد کے اصل خالق تھے۔ اس لغو اور بوگس دعوے سے اس پروپیگنڈہ نے جنم پایا کہ یہ پاکستان کی کوششوں اور دلچسپی کی وجہ سے ہوا تھا اور امریکہ کو شاید اس میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے امریکہ اس علاقے میں بڑھتے ہوئے خطرات کی وجہ سے بالکل تنہا ہو کر رہ گیا تھا اور مغرب کے تیل کے مفادات مکمل طور پر خطرے کی زد میں تھے۔ وہ اہم واقعہ جو کہ امریکہ کی اس خطے میں نئی خارجہ پالیسی کی بنیاد بنا وہ ایران کے وزیراعظم محمد مصدق کی طرف سے ایران کی تیل کی صنعت کو قومیائے جانے کا عمل تھا جس سے مغربی قوتوں کو مشرق وسطی میں مستقبل میں آنے والے خطرات کا اندازہ ہونا شروع ہو گیا۔ ان حالات میں مشرق وسطی کے تحفظ بالفاظ دیگر اس علاقے میں مغربی دنیا کے تیل کے مفادات کے تحفظ کے بارے میں ایک لائحہ عمل تیار کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

- بیرنڈز (Bamds) کا خیال ہے کہ "پاکستان امریکہ فوجی تعلقات کا پہلی دفعہ ذکر واشنگٹن میں ۱۹۵۱ میں سننے کو ملا۔ جب امریکہ کی فضائیہ نے پاکستانی ائیر بیس کو مستقبل میں استعمال کرنے میں دلچسپی ظاہر کی۔ جبکہ دیگر فوجی ضروریات کے لئے پاکستان کی زمینی فوج کو بھی براعظم ایشیا کے کئی مقامات پر استعمال میں لائے جانے پر بھی غور کیا جا سکتا تھا۔ ان ہی مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے پاکستان اور امریکہ کے درمیان ۱۹۵۲ کے وسط میں فوجی امداد کے لئے معاہدہ ہوا لیکن اس میں حقیقی پیش رفت ۱۹۵۳ میں آئزن ہاور انتظامیہ کے اقتدار سنبھالنے کے بعد اس وقت ہوئی جب (Dulles brothers) نے امریکی وزارت خارجہ اور CIA کا انتظام سنبھالا۔ امریکہ کی اس علاقے کے بارے میں نئی بننے والی حکمت عملی میں ہندوستان کا کردار بہت محدود تھا سوائے اس کے کہ امریکہ پاکستان سے اپنے تعلقات میں گرم جوشی کے باعث ہندوستان کے ساتھ اپنے بہتر تعلقات کو Risk پر رکھنا پڑا لیکن پھر بھی امریکہ نے کوشش کی کہ وہ اپنے اقدامات سے ہندوستان کو کم سے کم ناراض کرے۔

تاریخی پس منظر:

یہ بات شاید زیادہ سودمند ثابت ہو کہ ہم اس اہم معاملے کا جائزہ لینے کے لئے اس کے

پس منظر کو تاریخی تناظر میں دیکھیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اور فرانس کی بین الاقوامی حیثیت اور نوآبادیاتی علاقوں پر سے ان کے قبضے کمزور پڑنے لگے اور اس کے متوازی امریکہ دنیا کے نقشے پر ایک ممکنہ عالمی قوت کے طور پر اُبھر کر سامنے آنا شروع ہوا۔ بعدازاں نئی آنے والی تبدیلیوں کے باعث پاکستان کے امریکہ سے تعلقات مغرب کے دیگر اہم سرمایہ دار ممالک مقابلے میں خصوصی طور پر جدا اور منفرد انداز میں آگے بڑھنے لگے اور پاکستان کی حیثیت ایک ایسے ملک کے طور پر سامنے آئی جہاں بلاواسطہ طور پر نئے نوآبادیاتی طرز کے نظام کو جاری رہنا تھا۔ امریکہ مختلف اوقات میں پاکستان کی بننے والی حکومتوں اور انکے قائم رہنے، ان کی وزارتوں اور ان کے وزارتوں کے قلمدانوں کو منتخب کئے جانے میں بھی فیصلہ کن کردار ادا کرتا رہا۔ لیکن یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ یہ بالواسطہ کنٹرول اس نوعیت کا نہیں جو کہ براہ راست نوآبادیاتی دور میں ہوا کرتا تھا۔ امریکہ کا پاکستان کے اندرونی حالات پر انتہائی گہرا اثر ،نفوذ بن گیا تھا۔ لیکن یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ یہ اثر نفوذ کئی پریشانیوں اور تضادات کے ساتھ منسلک تھا اور کئی مراحل پر تو امریکہ کو پاکستان میں اپنا کنٹرول برقرار رکھنے اور چیزوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کے لئے manipulate بھی کرنا پڑا اور یہ ضروری نہیں تھا کہ اس کو ہر بار اپنے مقاصد کے حصول کے لئے مکمل طور پر کامیابی ہی حاصل ہو۔ اس کی ایک واضح مثال پاکستان کا نوآبادیاتی ریاست ہونے کے باوجود اپنے ایٹمی پروگرام کے بارے میں نسبتاً آزادانہ پالیسی اپنانے کی ہے۔ پاکستان نے تمام تر دباؤ اور پابندیوں کے باوجود جس میں کئی مواقعوں پر اقتصادی اور فوجی امداد کی بندشیں بھی شامل ہیں لیکن اس کے باوجود امریکہ اس سلسلے میں پاکستان پر بہت زیادہ دباؤ ڈالنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ امریکہ اور پاکستان کے تعلقات اکثر و بیشتر غیر ہموار اور پیچیدہ رہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تقسیم کے بعد کے ابتدائی پانچ برسوں میں پاکستان بین الاقوامی حالات میں خود کو نہایت غیر محفوظ سمجھتا رہا اور خاص طور پر اسکے تعلقات امریکہ، برطانیہ اور سوویت یونین کے ساتھ کوئی خاص گرم جوشی کے نہ رہے اور خصوصی طور پر ہندوستان کے ساتھ اسکے شدید اختلافات پروان چڑھتے رہے۔ برطانوی اور امریکی سرمایہ کے لئے ہندوستان ایک بڑی اقتصادی منڈی تھا جبکہ اس کے مقابلے میں پاکستان ایک پس ماندہ اور چھوٹا ملک تھا جو کہ اقتصادی طور پر سرمایہ دار ریاستوں کے لئے کوئی زیادہ پُرکشش مواقع فراہم کرنے سے قاصر تھا۔ امریکہ اور برطانیہ کے

لئے کسی بھی مرحلے پر ہندوستان سے تعلقات کشیدہ کر کے پاکستان سے تعلقات قائم کرنے میں کوئی دانشمندی نہ تھی۔ برطانیہ میں اس وقت لیبر پارٹی کی حکومت تھی اور اس کی سیاسی قیادت کا ہندوستان کی برسراقتدار جماعت انڈین نیشنل کانگریس کے سیاسی قائدین کے ساتھ طویل اور گہرے مراسم تھے۔ برطانیہ کی مزدور تحریک نے ہمیشہ کانگریس کو جنوبی ایشیا میں جمہوریت کی بحالی کا ایک اہم ذریعہ سمجھا جبکہ اس کے مقابلے میں اس کا رویہ پاکستان مسلم لیگ کے لئے درشتگی (Hostity) پر مبنی تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ مسلم لیگ کی سیاست علاقے میں مذہبی تفرقہ بندی (communal) کا باعث بن گئی تھی۔ بالکل اسی طرح امریکہ میں بھی ڈیموکریٹس (Democrats) حکومت میں شامل تھے۔ان کے بھی انڈین نیشنل کانگریس کی قیادت کے ساتھ اچھے مراسم تھے اور وہ بھی مسلم لیگ کو ان ہی سطور پر دیکھ رہے تھے جیسا کہ برطانیہ کی لیبر پارٹی دیکھ رہی تھی۔اس لئے پاکستان کے بارے میں ان دونوں ممالک میں شکوک وشبہات موجود تھے۔اسی طرح پاکستانی رہنما اپنے نظریاتی مسائل اور سوویت یونین کے ہندوستان کی طرف ہمدردانہ رویئے کی وجہ سے سوویت یونین کو ایک متبادل قوت کے طور پر دیکھ نہیں سکتے تھے۔اس ساری صورتحال میں توجہ کا مرکز ہندوستان تھا اور پاکستان اس صورتحال میں تنہائی کا شکار تھا اور پاکستان کی سیاسی قیادت نے اپنے آپ کو ان حالات میں دنیا میں سیاسی یتیم کے طور پر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ پاکستان کے پاس اپنی آزادی کے ابتدائی پانچ چھ برسوں میں اپنی خارجہ پالیسی میں غیر جانب داری کا رویہ اپنانے کے علاوہ کوئی راستہ میسر نہ تھا۔شاید یہ بات ان کے لئے حیرت کا باعث بنے جن کا خیال یہ ہے کہ پاکستان ابتداء ہی سے امریکہ کی ایک سیٹلائیٹ(satellite) ریاست بن کر رہ گیا تھا۔جبکہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی ابتدائی پانچ برسوں میں غیر جانبدار اور غیر وابستہ (non-alligned) سطور پر استوار تھی۔ یہ صورتحال پاکستان نے کسی نظریاتی بنیادوں پر منتخب نہیں کی تھی بلکہ وہ حالات تھے جسکی وجہ سے پاکستان کو اس صورتحال کا انتخاب کرنا پڑا۔اسی لئے تمام تر اختلافات اور تضادات کے باوجود اس تمام عرصے میں پاکستانی وزیراعظم لیاقت علی خان ہندوستانی وزیراعظم نہرو کے ساتھ بیشتر مواقعوں پر غیر جانب داری کا رویہ اپناتے ہوئے شانے سے شانہ ملا کر کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ یہ تمام تر ہم آہنگی کشمیر کے مسئلہ پر پائے جانے والے تناؤ اور وزیراعظم لیاقت علی خان کی اس

تنازعے میں ذاتی دلچسپی اور ذاتی لگاؤ کے باوجود موجود تھی۔لیاقت علی خان نے مئی ۱۹۵۰ میں امریکی امداد کے حصول کے لئے امریکہ کا دورہ کیا۔سرد جنگ کے پس منظر میں جس کی رو سے امریکیوں کا خیال تھا کہ وہ ممالک اور قومیں جو ان کے کیمپ میں شامل نہ ہوں انھیں دشمن کے کیمپ میں شامل تصور کیا جائے گا۔ان حالات میں لیاقت علی خان کا امریکہ میں خطاب کرتے ہوئے اپنی پہلی تقریر میں یہ بات واضح طور پر کہنا کہ "کسی بھی ملک کا کوئی مستقل دوست اور دشمن نہیں ہوتا بلکہ مستقل چیز صرف ملکی مفادات ہوتے ہیں" بڑی جرأت کی بات تھی۔اس کے ساتھ ہی انھوں نے اس موقع پر پاکستان کے دیرینہ (eternal) اور مستقل مفادات کا ذکر سرد جنگ کا حوالہ دئے بغیر کیا۔امریکہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ اتنی بات کہنے سے زیادہ آگے نہ بڑھے کہ امریکہ اور پاکستان عالمی صورتحال کے تناظر میں اپنے معاملات کو بہتر طریقے سے سمجھتے ہوئے مزید ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں۔مگر اس کا کہیں یہ مطلب نہیں تھا کہ پاکستان امریکہ کے کیمپ میں شامل ہونے کے لئے تیار تھا۔یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ اس دورے میں بغیر کچھ حاصل کئے خالی ہاتھ لوٹے۔لیاقت علی خان کے دور حکومت میں پاکستان کی اپنائی گئی غیر جانب دارانہ خارجہ پالیسی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔مضمون نگار نے اس بات کو ۱۹۶۲ میں جریدہ "پاکستان ٹوڈے" (Pakistan Today) میں شائع ہونے والے مضمون "پاکستان پر امریکہ کی امداد کا بوجھ" سے لگایا اور حالیہ دنوں میں بیرنڈز (Brands) نے پاکستان کی اس غیر جانبدارانہ پالیسی کو ظاہر کیا اور لکھا ہے کہ "پاکستان ۱۹۴۷ سے ایک غیر جانبدارانہ پالیسی پر کاربند رہا اسکے ساتھ ہی وہ بین الاقوامی سیاست میں عمومی طور پر دیگر مسلمان ممالک سے علیحدہ ہو کر بھی رہنا نہیں چاہتا تھا اور خاص طور پر بلکہ عرب ممالک سے جدا ہو کر بھی رہنے کا خواہشمند نہ تھا۔اہم بات یہ ہے کہ اس وقت اکثر مسلمان ممالک مغربی ممالک اور انکی دفاعی پالیسیوں اور ترجیحات سے سخت نالاں تھے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کی اس غیر جانبدارانہ ترجیحات اور عرب ممالک کی طرف خصوصی جھکاؤ کو ایک غلط رنگ میں سمجھا جاتا ہے اور یہ تصور کیا جاتا ہے کہ شاید ہم اب بھی ۱۹۵۱ کے ان حالات میں رہ رہے ہیں جہاں مشرق وسطی کے اکثر ممالک میں برطانیہ کے زیر سرپرستی دائیں بازو کے رجعت پسند حکمران برسر اقتدار تھے۔اور جہاں جمال عبدالناصر اور اس کی عرب نیشنلزم کے فلسفے کو عرب کے عوام کے ذہنوں اور دلوں میں گرفت پکڑنا تھی۔اور اسی طرح پاکستان کی غیر جانبدارانہ

پالیسی کے پس پشت بھی کوئی ارادی کاوش اور نپا تلا انتخاب نہ تھا۔ پاکستان کی یہ پالیسی ان بین الاقوامی حالات میں جہاں مغرب میں اس ملک کے وجود پر شکوک وشبہات پائے جا رہے تھے یہ غیر جانبدارانہ پالیسی بڑا جرأتمندانہ نہ قدم تھا جبکہ اس کے مقابلے میں ان مغربی ممالک کا ہندوستان کی طرف خصوصی رویہ تھا۔ پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان مشرق اور مغرب کے تصادم میں غیر جانبداری کا رویہ اپنانے کے پس پشت کئی عوامل کام کر رہے تھے۔ ہندوستان کی پاکستان کے مقابلے میں نسبتاً بہتر اور ترقی یافتہ اقتصادی بنیاد اور مستقبل میں ایک آزادانہ اقتصادی منصوبہ بندی اور اقتصادی ترقی کے روشن امکانات اور مزید یہ کہ علاقے کا نسبتاً ایک بڑا ملک ہونے کے باعث تیسری دنیا اور اس علاقے کی ایک اہم طاقت ہونے کے باعث اسے کئی اطراف سے موافق حالات میسر آئے۔ پاکستان کی سیاسی قیادت کو آزادی کے ابتدائی برسوں میں جس بات نے پریشان کئے رکھا وہ اس کی دفاعی میدان میں کمزوری تھی۔ پاکستان کو سرے سے ایک نئی فوج کھڑا کرنا تھی۔ یہ وہ مسئلہ تھا جس کا ہندوستان کو سامنا کرنا پڑا۔ لارڈ برڈ ووڈ (Lord Birdwood) جو کہ خود برطانیہ کی کنزرویٹو پارٹی کے دفاعی امور کی کمیٹی کے مشیر تھے اور ہندوستان کی برطانوی فوج کے کمانڈر انچیف کے بیٹے تھے۔ وہ یہ بات لکھتے ہیں کہ " سکھ، مرہٹہ، ڈوگرا فوج پر مشتمل فوجی یونٹس فوری طور پر ہندوستان کی فوج میں شامل ہو گئے کیونکہ وہ تمام لوگ ہندو تھے۔ پنجاب کی infantry regiments کے تمام اسکواڈرن جس میں ہندو سکھ مسلمان بھی شامل تھے وہ بھی ہندوستانی فوج کا حصہ بن گئے۔ ایک اہم مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب ان یونٹوں کو تقسیم کرنے کی بات ہوئی جہاں مسلمان، ہندو سکھ تعداد میں برابر تھے اور انہیں تقسیم کیا جانا ضروری تھا۔ اس صورت میں ہر چیز کو ابتداء سے شروع کرنا تھا۔ نئے یونٹ اور انکی رہائش کا بندوبست کرنا تھا بلکہ "سب سے زیادہ توجہ طلب بات یہ تھی کہ نئی وفاداریاں بنانا تھیں"۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان کی فوج کو مکمل طور پر نئی طرح سے منظم کرنا تھا۔ نئے یونٹ بناتے تھے اور ان کو اکٹھا کرنا تھا۔ پاکستان کے پاس حقیقی معنوں میں ایک عرصے تک عملی طور پر نہ تو ایک پر اثر اور منظم آرمی تھی اور نہ ہی ضروری جنگی ہتھیار۔ پاکستان کے لئے ایک اور مشکل کا باعث ان ہتھیاروں اور ملٹری اسٹورز (Stores) کا بروقت نہ پہنچنا تھا جو کہ تقسیم کے منصوبے کے تحت انھیں مل چکے تھے مگر وہ ہندوستان میں طویل فاصلوں پر اور دور دور جگہوں پر موجود تھے۔ جنرل آکنلیک (Auchinleck) کی

زیر قیادت فوجی اثاثوں کی دونوں افواج کی تقسیم کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی اور اس کے لئے ایک مشترکہ دفاعی کونسل بھی بنائی گئی جو کہ ان اثاثوں کی تقسیم کے اس سارے عمل کی نگراں مقرر ہوئی۔ ان دونوں اداروں کو تقسیم کے طے شدہ منصوبے کے مطابق مارچ ۱۹۴۸ تک کام کرنا تھا مگر ہندوستان کے اصرار پر اسے قبل از وقت نومبر ۱۹۴۷ نومبر میں ہی ختم کر دیا گیا۔ برڈ وڈ نے مزید یہ بات لکھی ہے کہ "پاکستان کو یہ شدید شکایت لاحق رہی کہ مشترکہ دفاعی کونسل کے فیصلوں کے باوجود پاکستان کی فوج کو اسلحہ منتقل کرنے کے احکامات پر عمل نہ ہو سکا جن کی منظوری دفاعی کونسل نے دی تھی۔ ان وجوہات کی بنیاد پر پاکستانیوں کو شدید ردِعمل کا اظہار کرنا پڑا۔ پاکستان کو اس ادارے کی موجودگی کے باوجود کوئی منصفانہ حصہ وصول نہ ہو سکا۔ اس لئے پاکستان کو مشترکہ کونسل کے خاتمے کی صورت میں مزید کسی نقصان کی فکر نہ تھی"۔ حد تو یہ ہوئی کہ پاکستان آرمی کے ہیڈ کوارٹر کے لئے مہیا کئے جانے والا ریکارڈ اور دیگر ضروری دستاویزات بھی نیو دہلی کے GHQ میں ہی رہ گئیں۔ ان حالات میں یہ کوئی اچھے کی بات نہیں کہ ان حالات میں فوج کے لئے نئے ہتھیاروں کا حصول اور اسکا انتظام ایک انتہائی اولیں ضرورت بن گئی تھی۔ پاکستان کے پاس ان مسائل سے نپٹنے کے لئے حل محدود تھے۔ یورپ جنگ عظیم دوم کی تباہیوں سے بامشکل نکل رہا تھا اور جنگ سے تباہ حال اقتصادی صورتحال کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ان حالات میں پاکستان کے لئے اسلحہ کی فراہمی کا واحد ذریعہ امریکہ ہی بن سکتا تھا۔ پاکستان کی حکومت نے کوئی وقت ضائع کئے بغیر اپنی زمینی فوج اور فضائی افواج کے لئے اسلحہ اور انکی خریداری کے لئے مطلوبہ قرضوں کے لئے امریکہ سے فوری رابطہ کیا۔ لیکن اس وقت امریکہ کی ترجیحات میں پاکستان کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ اس وقت امریکہ کے مفادات مشرق بعید اور مشرق وسطیٰ میں تھے جہاں تک جنوبی ایشیا میں مفادات کی بات ہے تو امریکہ پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان کے ساتھ تعلقات قائم کرنے اور بڑھانے میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا کیونکہ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان امریکی سرمایہ کاروں کے لئے بہت کم پرکشش تھا۔ پاکستان کے اسلحے کی خریداری کے لئے بے تابی اور امریکہ کی طرف سے ان عرضیوں اور درخواستوں پر بار بار انکار کے باوجود پاکستان امریکہ سے اسلحے کی فروخت کے لئے مسلسل التجا کرتا رہا۔ لیکن امریکہ نے پاکستان پر اسلحے کی فراہمی پر سے پابندیاں ہٹانے سے صاف انکار کر دیا۔ اسی دوران پاکستان

نے کھلی مارکیٹ سے دوسری جنگ کے بچے کھچے اسلحے کی خریداری کے لئے کوششیں شروع کردیں پاکستان کی فوج کے ایک اہم تاریخ دان میجر جنرل فضل مقیم خان اپنی کتاب میں ان ۱۵ مختلف ممالک کا ذکر کرتے ہیں جن سے پاکستان نے اس دوران اسلحہ خریدار کے لئے رابطے کئے جب کہ ان کے خیال میں یہ اسلحہ پاکستان آرمی کی ضرورت پوری کرنے کے لئے کافی نہ تھا۔ اسی دوران براطانیہ کے خفیہ اداروں نے یہ معلومات اکھٹا کی کہ پاکستان اسلحہ کے لئے چیکوسلاویہ سے مذاکرات کررہا ہے اور یہ اطلاع برطانیہ نے امریکی اداروں کو پہنچا دی۔ اس وقت تک پینٹا گون نے بھی پاکستان کے فضائی اڈوں کو سوویت یونین کے خلاف استعمال کرنے کی ممکنات پر غور کرنا شروع کردیا تھا۔ جس کے باعث امریکہ نے ۱۹۴۹ میں پاکستان پر دفاعی اسلحے کی خریداری کے لئے عائد پابندی جزوی طور پر اٹھالی اور پاکستان کو محدود پیمانے پر اسلحے کی خریداری کی اجازت دے دی۔ امریکہ کا خیال تھا کہ ایک طرف تو اس سے پاکستان کو خوش کیا جاسکتا ہے اور دوسری طرف اسے کیمونسٹ ممالک سے اسلحہ کی خریداری سے روکا جاسکتا تھا۔ امریکہ کو اس بات کی بھی امید تھی کہ اس کے نتیجے میں پاکستان میں امریکہ کے لئے خیر سگالی کا ماحول پیدا کیا جاسکتا ہے اور مستقبل میں پاکستان کی سرزمین اور فوج کو سوویت یونین کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے۔

امریکہ کا یہ بھی خیال تھا کہ پاکستان کو اسلحہ کی قلیل پیمانے پر فراہمی ہندوستان کو سنجیدہ طور پر ناراض کرنے کا باعث نہیں بنے گی۔ پاکستان کو اسلحہ کی فراہمی کا یہ اقدام امریکہ کی خارجہ پالیسی میں کسی بڑی تبدیلی کا عندیہ نہیں دے رہا تھا۔ لیکن علاقے کی جغرافیائی صورت حال ڈرامائی طور پر مارچ ۱۹۵۱ مارچ میں ایران کے نیشنلسٹ رہنما محمد مصدق کے تیل کی صنعت کو قومیائے جانے سے ہوئی۔ برطانیہ اور مغربی طاقتیں کسی بھی صورت اس حال میں نہیں تھیں کہ وہ باوجود پریشانی میں مبتلا ہونے کے ایران کے اس اقدام کے خلاف کوئی فوجی کارروائی کرسکیں۔ برطانیہ کی سوشلسٹ حکومت کے وزیر خارجہ مورلیسن نے ایران کے اس قومیائے جانے کے عمل کی شدید مخالفت کرتے ہوئے اس کی سرکاری کمپنی کو وہ حقوق دینے سے انکار کردیئے جو کہ برطانیہ نے اپنی تیل نکالنے والی کمپنیوں کو دیئے ہوئے ایران کے لئے فوری پریشانی کی وجہ برطانیہ کا وہ قدم بھی بنا جس کے تحت برطانیہ نے ایران میں تیل نکالنے اور اس کی صفائی کے عمل میں مصروف برطانوی انجینئروں اور دیگر اہلکاروں کو فوری طور پر واپس بلانے کے فیصلہ نے ایران کے لئے مشکلات پیدا کردیں، جس

کے نتیجے میں ایران میں تیل صاف کرنے کی سب سے بڑی ریفائنری جولائی ۱۹۵۱ میں بند کردی گئی۔ برطانیہ نے ایران کے تیل کو بیرونی دنیا تک پہنچانے کے تمام ذرائع کو روکنے کے لئے ہر ممکن طریقے پر فوری عمل درآمد شروع کردیا۔ اس واقعے نے مغرب کی فوجی صلاحیت کی حقیقت عیاں کردی۔ ایران پر سفارتی دباؤ بڑھا دیا گیا۔ برطانیہ نے ایران کے قومیائے جانے کے عمل کو بین الاقوامی عدالت انصاف اور اقوام متحدہ کی سیکیوریٹی کاؤنسل میں اٹھایا لیکن ان تمام کوششوں کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ برطانیہ کی بحری افواج کے یونٹ خلیج فارس (Persian Gulf) پہنچ گئے جبکہ ۳۰۰۰ برطانوی فوجیوں کو قبرص (Cyprus) پہنچا دیا گیا تاکہ وہ ایران کے خلاف کسی فوری ہنگامی صورتحال میں کاروائی کرسکیں۔ لیکن یہ بات بھی سب کو پتا تھی کہ یہ صرف اور صرف دکھاوے کے اقدامات ہیں اور برطانیہ کسی بھی طرح اب اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ وہ ایران کے خلاف کوئی بڑی فوجی کاروائی کرسکے۔ جبکہ قبل ازیں برطانیہ کے لئے آسان تھا کہ وہ مقبوضہ ہندوستان سے فوجوں کو ایران کی آئل ریفائنری تک بھیج کر ان پر باآسانی قبضہ کرسکتا تھا۔ لیکن اب برطانیہ کے پاس ماضی کا براہ راست فوجی مداخلت کا استعماری (Imperial) راستہ موجود نہ تھا۔ برطانیہ نے شدید غصے اور دباؤ ڈالنے کے تمام طریقے اور حربے استعمال کئے مگر وہ ایران کے قومیائے جانے کے عمل کو واپس نہ کرا سکے۔ اس واقعے سے یہ بات پتہ چل گئی کہ اس خطے میں برطانیہ کے نکل جانے اور ہندوستان اور پاکستان کی آزادی سے اس خطے میں ایک "طاقت کا خلاء" (power vaccum) پیدا ہو چکا ہے۔

برطانیہ کی ہندوستانی فوج صرف ایک قابض فوج نہ تھی بلکہ وہ ایک استعماری فوج تھی جو کہ برطانیہ کی عظیم سلطنت کے کنٹرول کو ہندوستان سے باہر دیگر علاقوں میں بھی اپنا تسلط برقرار رکھنے میں مدد فراہم کرتی تھی۔ برطانوی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلا حصہ اندرونی تحفظ کا دستہ (Internal Security Troop) تھا جبکہ دوسرا حصہ میدانی فوج پر مشتمل تھا اور اس کی ذمہ داریوں کا دائرہ کار وسیع تر استعماری مفادات کا تحفظ تھا۔ برطانوی ہندوستان درحقیقت وہ بنیاد تھی جہاں سے برطانیہ مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیاء میں اپنا کنٹرول بحال رکھتا تھا۔ اب ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے بعد برطانیہ کے لئے اس مرکز (Base) کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ برطانیہ نے یہ علاقہ خالی کرتے وقت مشرق وسطیٰ میں اپنے مفادات کے تحفظ کا پوری طرح انتظام

اورادراک نہیں کیا تھا۔ ایک اہم برطانوی افسر اولف کیرو (Olaf Caroe) جو کہ ایک وقت میں صوبہ سرحد (خیبر پختونخواہ) کے گورنر بھی رہ چکے تھے۔ اس نے اس مسئلے کا ادراک کر لیا تھا اور مغربی قوتوں بالشمول برطانیہ اور امریکہ کو یہ تجویز پیش کی تھی کہ وہ اس علاقے میں اور خصوصاً مشرق وسطی میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے اپنی موجودگی پاکستان کے علاقے میں ضرور رکھیں جس طرح کہ وہ قبل ازیں برطانوی ہندوستان میں ضرور رکھتے تھے۔ اولف کیرو کی اس تنبیہ کو ابتدائی طور پر سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ لارڈ برڈ وڈ نے اس اہم جغرافیائی تبدیلی کے بارے میں جسکا کہ اب تک نوٹس نہیں لیا گیا تھا اسکے بارے میں ان الفاظ میں آگاہ کیا: "اگر برطانوی دولت مشترکہ ۱۹۴۷ میں آنے والی تبدیلیوں کے بارے میں نسبتاً لاعلم (unaware) تھی تو باقی دنیا تو عمومی طور پر بے خبر تھی۔ تمام دنیا کی توجہ پاکستان اور ہندوستان کے باہمی تعلقات اور تضادات پر مرکوز تھی۔ جبکہ دیگر مسائل میں کشمیر کا تنازعہ اور ہندوستان کے نئے بننے والے آئین کے بارے میں دلچسپی تھی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے نقشے پر شمالی افریقہ سے چین کے سمندروں تک آنے والی اہم تبدیلی کو غور کئے بغیر جانے دیا گیا"۔

وہ آگے مزید لکھتے ہیں کہ "برطانیہ ہندوستان سے نکل جانے کے بعد اب وہ اس پوزیشن میں بھی نہ تھا کے خلیج فارس میں خوزستان (Khuzistan) کے مقام پر ۳۰۰ ملین پونڈ سے لگائی گئی تیل کی ریفائنری پر دوبارہ اپنے قبضے کے لئے فوری طور پر برطانوی فوج وہاں کو بھیج سکے" برڈ وڈ مزید کہتے ہیں کہ "ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کے عمل سے آنے والی اس بڑی تبدیلی کا مداوا اور سدباب اس طرح کیا جاسکتا تھا کہ پاکستان اپنی فوج بوقت ضرورت برطانوی اور دیگر مغربی قوتوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے مہیا کر سکے"۔ یہ خیال ہی دراصل پاکستان اور امریکہ کے فوجی اتحاد کی بنیاد بنا۔ امریکی دانشوروں اور مشیران نے بھی ان ہی سطور پر سوچنا شروع کر دیا۔ مشرق وسطی کے دفاع کے بارے میں لکھی گئی ایک کتاب میں ان ہی دانشوروں میں سے ایک نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ "روایتی طور پر دونوں عالمی جنگوں کے دوران مشرق وسطی کا تحفظ اور دفاع برطانیہ کی ہندوستانی افواج نے کیا تھا اسلئے اب بھی یہ ایک فطری بات تھی کہ مستقبل میں اس کام کو اسی کی کوئی قوت جاری رکھ سکے"۔

اس تصور کو آگے بڑھانے کے باوجود کیمبل (Campbell) کو اس بات کا خدشہ اور

وسوسہ لاحق تھا کہ کیا پاکستان آئندہ کسی دفاعی معاملات میں اس قسم کا کام انجام دے سکتا ہے؟
ظاہری طور پر امریکہ نے ایران۔ برطانیہ(Anglo-Iranian) تنازعے میں غیر جانبدار رویہ اپنائے رکھا تھا، اور اس معاملے میں ایک ایماندار رابطہ کار(honest broker) کا کردار ادا کرنے کا خواہش مند تھا۔لیکن اسکے ساتھ ہی ایران کے تیل کی صنعت کے قومیائے جانے کے باعث وہ پریشان ضرور تھا۔لیکن جیسا کہ رمضانی(Ramzani) اس تمام مسئلے کے اختتام پر یہ بات لکھتے ہیں " اس صورتحال میں سب سے بنیادی غور وفکر کی بات یہ تھی (۱) ایران برطانیہ جھگڑے کی صورت میں مغربی یورپ کو جو کہ اس وقت امریکہ کا مکمل اتحادی تھا اس وقت تیل کی ترسیل مکمل طور پر بند ہوسکتی تھی (۲) ایران کے تیل کو قومیائے جانے کے عمل سے خلیج فارس میں امریکی مفادات کو مزید دھچکہ لگنے کا خدشہ تھا(۳) برطانیہ کے اس علاقے سے نکل جانے کے بعد جنوب میں مغربی اثر ورسوخ نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا(۴) ایران میں اس سارے مسئلے کی کی وجہ سے ایران کی اپنی اقتصادیات کو شدید خطرات ہوسکتے جس کا فائدہ ایران کی تودہ پارٹی (Tudeh) کو پہنچ سکتا تھا اور جو بالآخر ایران میں کمیونسٹ خطرہ کا باعث بن سکتا تھا (Ramazani 1975)"مزید لکھتا ہے کہ "امریکی انتظامیہ دو سال بعد صدر آئزن ہاور کے دور اقتدار میں ایڈن(Eden) کی اس تجویز سے متفق ہوئی کہ بجائے اسکے کہ وہ ایران کی مصدق حکومت کو رام کرنے یا خریدنے کی کوشش کرے، بہتر یہ ہوگا کہ وہ اپنے مفادات کے حصول اور ان کے تحفظ کے لئے کسی دوسری متبادل ریاست کی تلاش شروع کردے"۔CIA کو اپنے اس مقصد کے حصول میں زیادہ وقت نہ لگا اور انہوں نے آپریشن اجکس (Operation Ajax) کی صورت میں ۱۹اگست ۱۹۵۳ کو مصدق حکومت کا تختہ پلٹ کر شاہ ایران کو تمام اختیارات کے ساتھ امریکی سائے میں بحال کردیا۔ CIA نے اپنے اس کام سے یہ بات ثابت کی کہ تبدیلی کتنی باآسانی لائی جاسکتی تھی۔بی بی سی کے ٹلی(Tully) یہ بات لکھتے ہیں کہ "اس تبدیلی کا امریکی اور دیگر مغربی ممالک کے تحفظات کے لئے لایا جانا نہایت ضروری تھی"وہ مزید یہ دعویٰ کرتا تھا کہ" یہ ابتداء سے اختتام تک مکمل طور پر امریکی کارروائی تھی"(Tully 1962)۔اس مسئلے کو مستقل طور پر حل کرنے کے لئے اس علاقے میں امریکہ کو مشرق وسطیٰ کے لئے ایک نئی حکمت عملی بنانے کی ضرورت تھی۔جس کے لئے مقامی زیر اثر حکومتوں(local clients) کا اتحاد بنانا ضروری تھا۔

پاکستان اور ترکی اس منصوبہ بندی میں کلیدی کردار ادا کر سکتے تھے۔ پاکستان کو مطلوبہ کردار ادا کرنے کے لئے اپنی فوجی صلاحیت اور قوت کو بڑھانے کی شدید اور فوری ضرورت تھی۔ لیکن اپنی مالی مشکلات اور مسائل کے باعث اس مقصد کے حصول کے لئے اٹھنے والے فوجی اخراجات کے اضافی بوجھ کو پاکستان برداشت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ مشرقی پاکستان کی سیاسی قیادت خاص طور پر پاکستان کے بڑھتے ہوئے فوجی اخراجات سے خوش نہیں تھی کیونکہ اس دفاعی اخراجات کا بہت کم حصہ مشرقی پاکستان پر خرچ کیا جاتا تھا۔ اس وقت جب اس اتحاد کی باتیں شروع ہوئی تو مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین جنھیں عام طور پر کمزور شخص سمجھا جاتا تھا انھوں نے اس منصوبے کی بھرپور مخالفت کی اس مرحلے پر انھوں نے مشرقی پاکستانیوں کے احساسات کا اظہار کرتے ہوئے یہ بات کہی کہ مشرقی پاکستان میں جہاں ترقیاتی عمل کو بری طرح نظر انداز کیا جاتا رہا تھا اس کے لئے رقم اضافی مختص کی جائے۔ مشرقی پاکستان کی شدید مخالفت کے باعث وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کسی بھی طرح اس اتحاد کے حق میں نہ تھے۔ خواجہ ناظم الدین کی مخالفت کے باعث اتحادی منصوبے کو آگے بڑھانے کے لئے ناظم الدین حکومت کو ہٹایا جانا ضروری ہوگیا۔ خواجہ ناظم الدین کو لیاقت علی خان کے قتل کے بعد ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ کو وزیر اعظم بنایا گیا تھا۔ اس ساری تبدیلی کے عمل میں وزیر خزانہ غلام محمد جو کہ ایک طاقتور شخص تھا اور بیوروکریسی پر مکمل کنٹرول رکھتا تھا اور وہ یقیناً امریکہ کا پسندیدہ (favourite) بھی تھا۔ اس نے گورنر جنرل کے کلیدی عہدے کا چارج سنبھال لیا۔ یہ وہ عہدہ تھا جس کے پاس آئین اور قانون کے تحت وسیع تر اختیارات حاصل تھے۔ یہ عہدہ اور دفتر خواجہ ناظم الدین سے قبل ہی اقتدار کا محور بن گیا تھا اور کسی بھی طور صرف علامتی طور پر کام نہیں کر رہا تھا۔ جیسا کہ خواجہ ناظم الدین کے گورنر جنرل بننے کے بعد ہوا۔ غلام محمد نے گورنر جنرل بننے کے بعد دوبارہ اس دفتر کو متحرک کرتے ہوئے ملکی معاملات اور خارجہ پالیسی میں ایک سرگرم اور فیصلہ کن کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ تین اہم افراد جو کہ امریکہ سے اتحاد کے مکمل حامی تھے وہ اقتدار کے تین ایوانوں پر قابض ہوگئے ان تینوں میں سے امریکہ کا مکمل انحصار نئے گورنر جنرل غلام محمد پر تھا جبکہ دوسرے جنرل سکندر مرزا تھے جو کہ سیکریٹری دفاع بنے جبکہ ایوب خان پاکستان آرمی کے کمانڈران چیف مقرر ہوئے۔ لیکن ان سب کو ان کلیدی عہدوں تک پہنچانے سے قبل خواجہ ناظم الدین کی حکومت کا خاتمہ کرنا ضروری

تھا۔اس مقصد کے حصول کے لئے امریکی ایجنسیوں اور " تین کے گروہ"(gang of three) نے پاکستان میں نئے سیاسی ناظم کے قیام کے لئے اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔خواجہ ناظم الدین کی حکومت کو کمزور کرنے کے لئے مختلف قسم کے فسادات، احتجاج اور مسائل کھڑے کئے گئے جس میں پنجاب میں احمدیہ فرقے کے خلاف ہونے والے فسادات بھی شامل تھے لیکن اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لئے ان لوگوں نے سب سے اہم کام ملک میں گندم کا مسئلہ اور مستقبل قریب میں نظر آنے والے قحط سالی کے ہوّے کو کھڑا کر دیا۔ان کی ان خواہشات کی تکمیل کو ایک موقع اس وقت ملا جب مغربی پاکستان میں۵۲-۱۹۵۱ میں گندم کی پیداوار نسبتاً کم ہوئی جس کی وجہ خشک سالی تھی اور اندازہ یہ لگایا گیا کہ آنے والی فصل مزید کم ہوگئی جس کی شاید وجہ پاکستانی دریاؤں کے پانی کا ہندوستان کی طرف رخ موڑنا تھا۔دریائی پانی کے ہندوستان کی طرف منتقلی کے مسئلے کو بہت زیادہ اچھالا گیا جس سے اس بات نے تقویت پکڑی کہ آنے والے سالوں میں خشک سالی بڑھ سکتی ہے۔اس صورتحال میں گندم کی ذخیرہ اندوزی شروع ہوگئی جس کی وجہ سے اس کی قیمت میں کئی گنا اضافہ ہونا شروع ہوگیا۔قیمت کے اس بڑھنے سے اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ مستقبل میں گندم کی کمی کی صورت میں ملک میں قحط سالی ہوسکتی ہے۔اپنی مارچ ۱۹۵۳ کی بجٹ تقریر میں وزیرخزانہ چودھری محمد علی نے یہ بات کہی کہ موجودہ سال ملک میں گندم کی پیداوار میں کمی ایک ملین ٹن کے قریب ہوسکتی تھی جو کہ ملک کی کل پیداوار کا ایک چوتھائی کے برابر تھی۔پریشانی کی اس حالت میں خواجہ ناظم الدین کی حکومت نے امریکہ اور دیگر کئی ممالک سے فوری طور پر ہمدردانہ بنیادوں پر زرعی اجناس کی مدد کی اپیل کی تاکہ اس مسئلے سے نپٹا جا سکے۔کینیڈا اور آسٹریلیا سے اس درخواست کے نتیجے میں فوری طور پر ایک لاکھ ساٹھ ہزار ٹن گندم پہنچ گئی لیکن یہ امداد گندم کی ملک میں کل کمی کا صرف ۶ فیصد تھی۔لیکن امریکہ جس سے یہ امید کی جارہی تھی کہ وہ مشکل کی اس گھڑی میں سب سے بڑا امداد فراہم کرنے والا ملک ہوگا اس کی طرف سے ہمدردی کا ایک لفظ بھی نہیں آیا۔امریکہ سے کسی امداد نہ ملنے کے باعث خواجہ ناظم الدین حکومت مستعفی ہوگئی۔امریکہ نے اس امداد کی فراہمی کے وعدے کے عوض پاکستان سے سودا بازی کی اور امریکہ نے اپنے(protege) محمد علی بوگرہ کو وزیراعظم پاکستان بنانے کی تجویز پیش کی۔[9] اس تبدیلی کے باوجود غلام محمد نے ہی نظام حکومت چلانا تھا۔بوگرا کی حیثیت کٹھ پتلی(puppet) سے زیادہ نہ تھی لیکن سیاسی طور پر اس کا

بھی ایک فائدہ تھا چاہے ظاہری طور پر ہی بہر حال وہ وزیر اعظم کے طور پر کام کر رہے تھے چونکہ ان کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا اس طرح بنگال کو بھی قابو رکھنے کا آسان اور سستا طریقہ تلاش کر لیا گیا تھا۔ غلام محمد نے نہ صرف بوگرہ کابینہ کے لئے وزراء کا انتخاب کیا بلکہ محکمے بھی اپنی مرضی سے مختص کیے۔ بوگرہ اقتدار سے محروم صرف ایک نمائشی سربراہ حکومت تھے۔

جیسے ہی امریکہ کے مزاج کی نئی حکومت نے محمد علی بوگرہ کی قیادت میں حکومت سنبھالی تو امریکہ نے فوراً ۷ لاکھ ٹن گندم کی فوری امداد کا اعلان کر دیا جبکہ مزید اضافی طور پر ۳ لاکھ ٹن گندم مختص کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔ وعدہ کی گئی امداد کا ایک انتہائی قلیل حصہ کے پاکستان پہنچنے میں بھی کئی مہینے لگ گئے جبکہ اس دوران ملک میں گندم کی بڑی اچھی فصل پیدا ہو گئی، جس سے یہ بات واضح تھی کہ ملک میں قحط سالی کا "ہوا" ایک مصنوعی بات اور پروپیگنڈہ تھی لیکن پھر بھی سازش اپنا کام کر چکی تھی۔ یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ محمد علی بوگرہ جو کہ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے سیاستدان تھے وہ مشرقی پاکستان کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس لئے دفاع اور فوج پر اُٹھنے والے خرچ اور فوجی اتحاد کے بارے میں وہ بھی کوئی زیادہ سرگرم نہ تھے۔ لیکن وہ پاکستان کے تین ٹھگوں کے ہاتھوں یرغمال بنے ہوئے تھے۔ برانڈز لکھتا ہے کہ "وزیر اعظم محمد علی سیاسی اور اقتصادی معاملات کے بارے میں کافی سوچ بچار کرتے تھے اور امریکہ اور پاکستان کے اتحاد کے بارے میں عوامی رجحانات کے بارے میں شدید الجھنوں کا شکار تھے۔ لیکن ۱۹۵۳ کے خزاں تک علی بھی امریکی فوجی امداد کی حق میں نہ تھے۔ اس کے مقابلے میں اقتصادی امداد کو زیادہ اہمیت دے رہے تھے۔ ان کے خیال میں فوجی امداد نہ صرف اقتصادی امداد کی قیمت پر ملے گی بلکہ یہ آرمی چیف ایوب خان کو مزید مستحکم کرنے اور حکومت میں ان کی مزید مداخلت کا باعث بنے گی۔ جبکہ ان تینوں کے مقابلے میں محمد علی بوگرہ ایک بے اختیار وزیر اعظم تھے جو کہ صرف ایک فرنٹ مین (front man) کے طور پر کام کر رہے تھے۔ وہ اس سلسلے میں کچھ کرنے کے قابل نہ تھے جو کہ پاکستان نے امریکہ کے ساتھ اتحاد بنا کر نیا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔"

جنگی حکمت عملی:

اس نئے فوجی اتحاد بننے کے بعد مزید صف بندی کے لئے دیگر کئی نئے معاہدے کئے

گئے۔اس نئے تعلق کو باآسانی Client Garrison Strategy کہا جاسکتا ہے جس کے نتیجے میں پاکستان نے اس کام کی ذمہ داری اٹھائی کہ ضرورت کے وقت وہ امریکہ اور ایکے اتحادیوں کو فوجی جوان فراہم کریگا۔ خاص طور پر مشرق وسطیٰ یا کسی اور مقام پر مغربی طاقتوں کے مفادات کو قوم پرستوں، انتہا پسند تحریکوں، سے پریشانی لاحق ہونے کی صورت میں فوجی افرادی قوت فراہم کی جائے گی۔اس کے جواب میں امریکہ نے پاکستان کو فوجی مدد فراہم کرنے کا یقین دلایا جو کہ اس کو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے انتہائی ضروری ہوگئی تھی۔اگر اس بات کو مزید سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس کی مثال یوں ہوسکتی ہے کہ اگر مستقبل میں کسی وقت امریکہ کے اتحادی شاہ ایران کو ایرانی نیشنلسٹوں (قوم پرستوں) سے خطرہ لاحق ہو تو پاکستان یا ترکی فوری طور پر شاہ ایران کی مدد کریں گے اور شاہ ایران کو "سوویت یونین کے حمایت یافتہ کیمونسٹوں کے حملوں سے محفوظ کرنا بھی ترکی اور پاکستان کی ذمہ داری ہوگی۔ترکی اور پاکستان نے شمالی حصے کی اس سکیم (Northern Scheme) میں بڑا کلیدی کردار ادا کرنا تھا۔اس سکیم کی سرحدیں ایران سے لے کر تیل پیدا کرنے والے تمام عرب ممالک کی سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھی۔۱۹۵۳ کے آخر تک پاکستان اور امریکہ فوجی معاہدوں کے سلسلے میں بات چیت میں مصروف تھے۔۱۲اپریل ۱۹۵۴ کو پاکستان اور ترکی کے درمیان دوستی اور تعاون کے نئے معاہدوں پر دستخط ہوئے پاکستان اور امریکہ کے درمیان فوجی مدد کے معاہدے پر مئی ۱۹۵۴ میں دستخط ہوئے۔اس معاہدے کی ایک اہم شق یہ تھی کہ پاکستان اس علاقے میں سکیورٹی کے تمام کاموں میں مکمل طور پر مدد فراہم کریگا۔ترکی اور عراق کے درمیانی علاقے کے دفاع کے لئے ایک دفاعی معاہدہ ۱۹۵۴ میں ہوا جسے بعد میں بغداد معاہدے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔یہ معاہدہ دراصل ان تمام ریاستوں کو شریک ہونے کی دعوت دیتا تھا جو کہ "اس علاقے میں امن امداد اور سکیورٹی" کے خواہشمند تھے۔برطانیہ اس معاہدے میں ستمبر ۱۹۵۵ میں شریک ہوا جبکہ ایران اکتوبر میں شامل ہوا۔ان پانچ اراکین کے شامل ہونے کے بعد اب معاہدہ مکمل تھا۔ظاہری طور پر امریکہ نے اس معاہدہ میں شرکت نہیں کی لیکن عملی طور پر دیکھا جائے تو اس کے عین پشت امریکہ کی حمایت کارفرما تھی۔کیمبل کا خیال ہے کہ امریکہ نے اس معاہدے میں اس لئے شرکت نہیں کی کیونکہ امریکہ اب بھی کسی نہ کسی صورت سعودی عرب اور مصر کے ساتھ اپنے تعلقات بہتر رکھنا چاہتا تھا اور کسی بھی موقع پر سوویت یونین کو

یہ موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ مشرق وسطی امریکہ میں اس کی موجودگی کو جواز بنا کر خود مشرق وسطی میں براہ راست مداخلت کردے۔ اسکے علاوہ امریکہ اسرائیل کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا جو کہ اس کے اس کے معاہدے کے حق میں نہ تھا۔ کیونکہ اس کے خیال میں اس معاہدے کے نتیجے میں اس کے کئی عرب دشمن ممالک دفاعی طور پر مستحکم ہو سکتے تھے۔ اسکے ساتھ ہی امریکہ کو اس معاہدے میں شریک ہونے کی صورت میں ان معاملات کی سینیٹ سے منظوری حاصل کرنا پڑتی اس صورتحال میں اسے داخلی اور خارجہ امور اور بالخصوص مشرق وسطی کے متعلق کئی تفصیلات بتانا پڑتی۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس خطے کے بارے میں امریکہ کی خارجہ پالیسی ایک مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر کھڑی ہو رہی تھی۔ یہاں ہمارے لئے خصوصی دلچسپی کی بات یہ ہے کہ مشرق وسطی میں مغربی ممالک کے مفادات کے تحفظ کے عوض پاکستان کو ملنے والی امریکی امداد کا استعمال کس طرح ہوا اور یہ کہ استعمال کس طرح ان تمام معاملات پر اپنا کنٹرول برقرار رکھا۔ اس وقت کی پاکستانی حکمران جنتا (Junta) کے یہ دعوے کہ پاکستان کو ملنے والی یہ امداد ملک کے دفاعی نظام کو ہندوستان کے مقابل مستحکم کرے گی۔ یہ تمام دعوے لغو ثابت ہوئے اور امریکہ کی طرف سے ہندوستان کو مکمل یقین دہانی کرائی گئی کہ پاکستان کو اس بات کی اجازت نہیں دی جائیگی کہ وہ امریکہ سے امداد میں ملنے والا اسلحہ ہندوستان کے خلاف استعمال کرے۔ امریکہ نے سیٹو معاہدے میں بھی شرائط اس طرح رکھیں کہ امریکی امداد صرف کیمونسٹ بلاک کے خلاف استعمال کی جاسکتی تھی۔ لیکن چونکہ بغداد معاہدہ میں امریکہ خود شریک نہ تھا اس لئے ایسی کوئی شرائط معاہدے کے ساتھ منسلک نہ تھیں۔ مزید یہ کہ امریکہ نے پاکستان کو دی جانے والی فوجی امداد پر مکمل نظر اور کنٹرول رکھنے کے لئے ایک مکمل طریقہ کار ترتیب دیا۔ امریکہ سے سے ملنے والے فوجی امداد کے پروگرام Military Assistance Program (MAP) میپ کے تحت پاکستان کی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک فوج کو MAP کا حصہ بنایا گیا جبکہ دوسری فوج غیر میپ MAP کی فوج پر مشتمل تھی۔ امریکہ سے ملنے والی امداد صرف MAP کے لئے مخصوص کر دی گئی جو کہ مشرق وسطی میں مغربی ممالک کے تحفظ کے کام کے لئے مختص کر دی گئی اور اس فوج کے ذمے یہ کام تجویز کیا گیا کہ مشرق وسطی میں مغربی ممالک کے مفادات کو کسی بھی ممکنہ خطرہ کے لاحق ہونے کی صورت میں فوری کارروائی کرے۔ یہ امریکی امداد اس غیر MAP افواج کے لئے نہیں تھی جو

کہ پاکستان اور ہندوستان کی سرحدوں پر تعینات تھی اور خاص طور پر کشمیر کے بارڈر پر متعین کی گئی تھی اور نہ ہی یہ امداد مشرقی پاکستان میں استعمال کی جا سکتی تھی۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لئے امریکہ کے اپنے اہلکار پاکستان کے آرمی ہیڈ کوارٹر GHQ میں تعینات کئے گئے تھے جو کہ بڑی سختی سے اس معاہدے پر عمل درآمد کو یقینی بناتے تھے۔ ۱۹۵۳ کے آخر میں پاکستان آرمی کے افسران پر مشتمل ایک پاکستان آرمی منصوبہ بندی بورڈ تشکیل دیا گیا جس کو امریکی مشیروں کی مدد حاصل تھی اور جس کے ذمے یہ کام سونپا گیا تھا کہ پاکستانی فوج، اس کے نئے اہداف اور مقاصد کی تشکیل نو، کے لئے نئی منصوبہ بندی کرے۔ فروری ۱۹۵۴ میں ایک امریکی فوج کا ایک سروے مشن (American Military Survey Mission) پاکستان آیا اور اسی سال اکتوبر میں پاکستان میں پاکستانی آرمی کے ہیڈ کوارٹر جی ایچ کیو GHQ میں امریکی فوجی امداد کا ایک صلاح کاری گروپ (US Military Assistance Advisoray Group (MAAG کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس گروپ کو پاکستان کے ملٹری ہیڈ کوارٹر GHQ میں فراہم کی گئی۔ GHQ میں اپنے قیام کے بعد MAAG نے پاکستان کے فوجی معاملات میں بڑا بھرپور کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ تا وقتیکہ کہ امریکہ کو اس گروپ کو ۱۹۶۵ میں پہلی پاکستان ہندوستان جنگ کی وجہ سے فوری طور پر بند کر کے پاکستان سے نکالنا پڑا اس طرح پاکستان کی فوج نے تمام حکومتی اور سیاسی چینلو بالشمول وزیر اعظم اور دفاعی اور وفاقی کابینہ کو نظر انداز کرتے ہوئے پینٹاگون اور امریکہ سے براہ راست اپنے تعلقات قائم کر لئے۔ ۱۹۵۶ میں اسٹیٹ بینک کے پہلے گورنر زاہد حسین نے راقم سے اس بات کا اظہار کیا کہ کئی سینئر وزراء اس بات پر پریشان اور رنجیدہ ہیں کہ فوج نے امریکہ سے براہ راست تعلق استوار کر لئے اور کئی وفاقی وزراء تک کو اس بات کا علم نہ تھا کہ امریکہ اور پاکستان کے درمیان کیا معاملات طے پا رہے تھے۔ امریکہ کا پاکستان کی فوج پر اثر بہت گہرا ہو چکا تھا۔ پاکستان آرمی کے نامور تاریخ دان میجر جنرل فضل مقیم خان اس بات کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "پاکستان آرمی کے افسران، کمانڈروں، اسٹاف اور فوجی منصوبہ بندی پر امریکہ کا اثر و رسوخ اپنا کام دکھا چکا تھا اور اس کے تحت ہی آرمی افسران کے لئے امریکہ کے دورے اور امریکہ کی اقتصادی امداد سے منعقد کئے جانے والے تربیتی کورسز کو کروانے کے لئے امریکہ کی تربیتی فورس کے کئی امریکی افسران مستقل طور پر GHQ میں تعینات کر دیئے گئے تھے۔

پاکستان آرمی کو نہ صرف دفاعی محاذ پر بلکہ ملک کے اندرونی نظام کو بھی بوقت ضرورت سنبھالنے کے لئے تیار کیا جا رہا تھا جس کا مقصد نظام کو استحکام فراہم کرنا تھا تا کہ ایسی مستحکم حکومت لائی جا سکے جو اس بات کے قابل ہو سکے کہ وہ امریکہ سے کئے گئے اتحاد کی شرائط وضوابط پر عمل درآمد کو یقینی بنا سکے۔ ۱۹۵۷ میں شائع ہونے والا دستاویزات امریکہ پاکستان باہمی دفاعی منصوبے کا خلاصہ (Summary Presentation of US Pakistan Mutual Security Program) اس معاہدے کی صورتحال کو اس طرح بیان کرتا ہے "سیاسی نقطہ نظر سے گو امریکہ نے پاکستان کی فوج کو مستحکم کر دیا ہے وہ فوج اس ملک میں استحکام پیدا کرنے والی تنہا اور سب سے طاقتور قوت بن گئی ہے اور اس کی وجہ سے پاکستان کا حوصلہ اس قدر بڑھا کہ وہ دفاع کے کئی مشترکہ منصوبوں میں شریک ہو گیا" اس تمام صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوج نے براہ راست اقتدار پر قابض نہ ہونے کے باجود سیاسی قیادت کو فیصلہ سازی کے عمل سے کنارہ کش کر دیا تھا۔ امریکہ اور مغربی ممالک کے مفادات کے تحفظ کی ذمہ داری کے کام کے عوض پاکستان مغربی ممالک کی فوجی امداد حاصل کرنے والا ملک بن گیا اور اسکا انحصار اس فوجی امداد پر بڑھتا ہی چلا گیا۔ اگر ہم اس ملنے والی امداد کا جائزہ لیں تو ایک دلچسپ صورتحال سامنے نظر آتی ہے۔ ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پاکستان کو اس تمام کام کے لئے امریکہ سے مکمل امداد نہ ملی بلکہ پاکستان کو اپنے محدود وسائل سے ایک کثیر رقم ان فوجی کاموں کے لئے خرچ کرنا پڑ رہی تھی جو کہ درحقیقت اس کے اپنے دفاع کے لئے نہیں تھے بلکہ اس خطے میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے تحفظ کے لئے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ فوج جو کہ مشرق وسطی اور اس خطے میں امریکہ اور اس کے مغربی اتحادیوں کے مفادات کے تحفظ پر تعینات تھی۔ اس فوج کی تنخواہوں کے اخراجات بھی پاکستان اپنے اندرونی بجٹ سے پورا کر رہا تھا جو کہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔ جبکہ امریکہ کی ذمہ داری صرف اسلحہ مہیا کرنے تک محدود تھی لیکن یہ اسلحہ بھی صرف MAP افواج کے لئے تھا جو کہ صرف مغربی ممالک، امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے استعمال کی جا سکتی تھی۔ اس صورتحال میں نہ صرف پاکستان کو ایک بڑا معاشی بوجھ برداشت کرنا پڑا بلکہ مشکل معاشی حالات کی صورت میں بھی ترجیح پاکستان کی non-MAP فوج کی بجائے MAP افواج کو دی جا رہی تھی اور یہ تمام خرچہ پاکستان اپنے دفاعی بجٹ سے کر رہا تھا، اور کسی بھی دفاعی کٹوتی کی صورت میں پاکستان کو یہ کٹوتی

non-MAP افواج سے کرنا پڑتی تھی حالانکہ یہ فوج پاکستان کی اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لئے تھی۔اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ پاکستان اپنے دفاع کو خطرے میں ڈال کر امریکی مفادات کو تحفظ فراہم کر رہا تھا۔کرنل جورڈن کے مطابق ۱۹۶۰ میں پاکستان کی کرنسی میں آنے والی تبدیلیوں کے باعث ہونے والے دفاعی اخراجات میں کمی بیشی کا براہ راست اثر غیر non-MAP افواج پر پڑا۔ پاکستان درحقیقت مشرق وسطی میں مغربی ممالک کے تیل مفادات کے تحفظات کے لئے بھاری قیمت ادا کر رہا تھا۔ یہ ایک آزاد ملک کے لئے عجیب صورتحال تھی۔فطری طور پر امریکہ اس تمام صورتحال اور دفاعی انتظامات پر بڑا خوش تھا۔اس صورتحال پر امریکی سینٹ میں ایک بیان دیتے ہوئے امریکہ کے وزیر خزانہ نے یہ بات کہی کہ "جہاں تک پاکستان کو فراہم کی جانے والی فوجی امداد ہے ہماری خواہش یہ کہ اس میں جتنا کم خرچ کر کے زیادہ سے زیادہ مفادات حاصل کئے جا سکے میں اسکا حمایتی رہونگا اور جتنے زیادہ فوج اس معاہدے میں انکی بھرپور حمایت کریگا" امریکی کانگریس کے ایک رکن Vorys نے امریکی ایوان نمائندگان کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ۱۹۵۶ میں باہمی دفاعی (Mutual Security Act) کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ " گزشتہ سال ایک انفرادی امریکی فوجی کو بیرون ملک ہاتھ بغیر بندوق دیئے تعینات کرنے پر امریکی حکومت کا سالانہ ۵۹۰۰ ڈالر خرچ آ رہا تھا جبکہ اسکے مقابلے میں ملک کی فوج کے ہاتھ میں بندوق دینے پر امریکی حکومت کا خرچہ صرف ۷۴۴ ڈالر آ رہا تھا اور یہ مقاصد مشترکہ سیکیورٹی نظام کے تحت یہ فائدے حاصل کئے جا رہے تھے" یقیناً یہ تمام معاہدے کلی طور پر امریکہ کے مفادات کو فائدہ پہنچا رہے تھے۔ یہ فائدے نہ صرف امریکہ کو اقتصادی طور پر فائدہ دے رہے تھے بلکہ ایک فائدہ یہ بھی درکار تھا۔ گندمی (brown) رنگ کے لوگوں کا خون سفید white کے مقابلے میں حقیر اور ارزاں تھا۔اس کے اندرون خانہ سیاسی جمع تفریق بھی شامل تھی۔ سیاسی اور بین الاقوامی مناظر میں ایران کسی بھی سیاسی بے چینی کی صورت میں بھیجی گئی پاکستانی فوج کے لئے شاید ایران میں اتنی نفرت نہ ہوتی جو کہ امریکہ کی افواج کو وہاں سامنا کرنا پڑتا۔شاہ کا کسی بھی خطرے کی صورت میں امریکی افواج کو دعوت دینا اس ملک میں استعماری اور نو آبادیاتی قوتوں کے خلاف نفرتوں کو مزید ہوا دینے کے برابر ہوتے اور یہ معاملات مزید خرابی کا باعث بن سکتے تھے۔اس لئے ایسی صورتحال میں امریکہ کی بجائے کسی دوسرے نیابتی proxy کی مدد سے

سیاسی طور پر ایک دانشمندانہ فیصلہ ہوتا۔

اپنائی گئی خریدار چھاؤنی منصوبہ بندی(Client Garrison Strategy) کے امریکہ میں عمومی اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ خصوصاً اس وقت کافی نقاد موجود تھے۔ان میں سے ایک اہم نقاد اور منہ پھٹ (Out Spoken) شخص سی بی مارشل CB Marshal تھا جو کہ امریکہ کے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے پالیسی پلاننگ ونگ کا ایک اہم رکن تھا اور ایک وقت میں پاکستان کے وزیراعظم حسین شہید سہروردی کے سیاسی مشیر بھی رہ چکا تھا۔اسکا خیال تھا کہ پاکستان کے سیاسی نظام کی کمزوریاں اور اس کی اندرون ملک کی غیر مستحکم سیاسی صورتحال مستقبل میں کسی مرحلے پر اپنے اتحادیوں کو کرائی گئی یقین دہانیوں میں رکاوٹ کا ایک اہم سبب بن سکتی تھی۔اور اسکا خیال تھا کہ اس صورت میں یہ اتحاد (امریکہ پاکستان اتحاد) شاید بہتر انداز میں کام نہ کر سکے۔کیمبل (Campbel) اسی دوران میں لکھتا ہے کہ " پاکستان ایک ایسی قوم ہے جو کہ ابھی تک سیاسی استحکام حاصل نہیں کر سکی اور اس لئے اس سے مشرق وسطی میں کسی بڑے کردار کی ادائیگی کی امید نہیں کی جا سکتی" (Campbell 1960)۔اس خریدار چھاؤنی طریقہ کار کو تجربہ کرنے کا ایک بہترین موقع عراق میں جنرل قاسم کے فوجی انقلاب کے موقع پر سامنے آیا اور یہاں پر پاکستان اس آزمائش میں بڑی بری طرح ناکام ہوگیا۔عراق میں امریکہ کی زیر قیادت فوجی مداخلت کی تجویز ایک ہنگامی اجلاس میں زیر غور آئی جو کہ انقرہ میں معاہدہ بغداد کے اتحادیوں کے درمیان ہوا (یقیناً اس اجلاس میں عراق شامل نہ تھا)۔اس فوجی مداخلت کو بعد ازاں کئی وجوہات کی بنیاد پر رد کر دیا گیا۔جن میں سے ایک اہم وجہ اس وقت پاکستان میں اندرون خانہ ایک بڑھتا ہوا سیاسی بحران تھا جسکا اختتام بالآخر چند ماہ بعد اکتوبر ۱۹۵۸ میں ایک فوجی مداخلت پر ہوا۔اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ خریدار چھاؤنی کا طریقہ کار کام نہ کر سکا اور نہ ہی یہ قابل عمل تھا اسی لئے امریکہ کو اسے چھوڑنا پڑا۔حالانکہ بغداد معاہدے کو دوبارہ سینٹو (Cento) معاہدے کی صورت میں بحال کرنے کی کوشش کی گئی جبکہ یہ معاہدہ ناکام ہو چکا تھا اب یہ امریکہ نے مشرق وسطی کے بارے میں اپنی دفاعی حکمت عملی کو نئے طریقے سے سوچنا شروع کیا جس میں پاکستان کا کوئی حصہ نہ تھا۔امریکہ کی اس نئی پالیسی میں جو کہ اسکو پاکستان سے دور اور متوازی طور پر اسے ہندوستان کے قریب لے جا رہی تھی۔اسی دوران ۱۹۵۹ میں ہندوستان کے دوسرے پنج سالہ منصوبے میں آنے والے بحران

اور ہندوستان کے اقتصادی مسائل سے نپٹنے کے لئے امریکی امداد کا انحصار اور خصوصی طور پر غذائی امداد کے حصول نے اسے اپنے غیر جانبدارانہ رویئے میں نرمی پیدا کرنے پر مجبور کر دیا۔۱۹۶۲ کی چین ہندوستان جنگ میں وہ فیصلہ کن مرحلہ سامنے آ گیا جس نے امریکہ اور ہندوستان کو مزید ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع فراہم کیا اور اور دونوں ممالک کو فوجی اور اقتصادی تعاون امداد کے لئے نئے مواقع فراہم کئے۔ اس صورتحال میں پاکستان امریکہ کے لئے اپنی اہمیت کھوتا جا رہا تھا اور اب پاکستان امریکہ کے لئے ایک بوجھ liability بن گیا تھا جو کہ اس کے ہندوستان سے تعلقات کی بحالی کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ بن گیا تھا جس کے لئے امریکہ نے اپنی خارجہ پالیسیوں میں مزید تبدیلی کی۔ امریکہ کی خارجہ پالیسی میں تبدیلی کی وجہ سے پاکستان بین الاقوامی طور پر تنہائی کا شکار ہو گیا۔ یقیناً اس طرح تو نہیں جس طرح وہ آزادی کے ابتدائی پانچ برسوں میں تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ پاکستان کے امریکہ سے تعلقات مزید خراب ہوتے چلے گئے۔ لیکن اس مرحلے پر ہندوستان کے بڑھتے ہوئے فوجی اخراجات اور دفاعی اسلحے کی بڑھتی ہوئی قوت کی وجہ سے پاکستان شدید پریشانی کا شکار ہوا۔ خاص طور پر جب ۱۹۶۲ کی جنگ کے بعد ہندوستان نے اپنی دفاعی صلاحیت کو بڑھانے کے لئے مزید اقدامات کرنا شروع کر دیئے۔ پاکستان کی فوج نے یہ بات محسوس کرنا شروع کی کہ علاقے میں جنگی توازن تیزی سے ہندوستان کی طرف منتقل ہو رہا تھا۔ اس پریشانی کی صورت میں ایوب خان نے ۱۹۶۵ میں ہندوستان سے کشمیر کو چھیننے کے لئے فوجی قوت استعمال کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اسے خوف تھا کہ مزید دیر کرنے کی صورت میں یہ موقع پھر کبھی نہ آ سکے گا۔ انھوں نے ہندوستان کے مقابلے میں پاکستانی فوجی برتری کے بارے میں بڑے غلط اندازے لگائے تھے لیکن یہ معاملہ اب یا کبھی نہیں کی صورتحال سے دوچار تھا۔ لیکن دیکھا جائے تو پاکستان کی طرف سے بغیر تیاری کے عجلت میں اٹھایا غیر دانشمندانہ فیصلہ تھا۔ یہ انتہائی غلط اور غیر دانشمندانہ فیصلہ تھا جس پر پاکستان کو بعد ازاں پچھتانا پڑا۔ امریکہ نے پاکستان کے جنگی اقدام پر شدید ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے اسلحے کی فراہمی اور اقتصادی امداد فوری طور پر منقطع کر دی۔ پاکستان اور امریکہ کے تعلقات بڑی حد تک کشیدہ ہو گئے حالانکہ ایوب خان نے پاکستان کے لئے امریکہ کی آشیرباد حاصل کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان نے چین کے ساتھ اپنے دیرینہ تعلقات قائم رکھنے کے لئے فرانس

کے ساتھ ساتھ چین سے اسلحہ حاصل کرنے کی کوشش شروع کردے اور تھوڑے ہی عرصے میں چین پاکستان کو اسلحہ فراہم کرنے کا ایک اہم ذریعہ بن گیا اس عرصے میں ایوب خان نے اس نئی صورتحال میں ایک نڈر (bold) فیصلہ کیا اور ملک کی نئی طرز پر خارجہ پالیسی بنانے کا فیصلہ کیا جسے Bilaterailsm کا نام دیا گیا۔۱۹۷۰ کی دہائی میں بھٹو کے دور حکومت میں پاکستان میں مشرق وسطیٰ کے تیل کی دولت سے مالا مال ممالک مالدار ملکوں کے ساتھ دوستی کے نئے رشتے استوار کرنے کی کوشش شروع ہوئی اور پاکستان نے اس خطے میں جاری ترقیاتی کاموں کے لئے افرادی قوت فراہم کرنا شروع کردی جس کے نتیجے میں ملک میں کثیر زرمبادلہ آنا شروع ہوگیا اور مزید یہ کہ بعد ازاں ان عرب ممالک سے اقتصادی امداد حاصل ہونا شروع ہوگئی جس سے ملک کی اقتصادی حالت بہتر ہونا شروع ہوگئی۔ جبکہ دوسری طرف پاکستان نے سعودی عرب کو فوجی جوان مہیا کرنا شروع کردیئے جو اس ملک میں شاہی خاندان کی حکمرانی قائم رکھنے میں مددگار ثابت ہوئے۔ اسی تناظر میں پاکستان میں اسلامی نظریئے (Islamic Ideology) اور مسلمان ممالک سے تعلقات کو استوار کرنے کے کام بڑھانے (exploit) کرنے کا سوچا گیا تاکہ ان ممالک کے ساتھ تعلقات کو دیرپا اور مستحکم بنایا جاسکے۔ امریکہ نے پاکستان کی طرف سے مشرق وسطیٰ کے ممالک سے تعلقات کی بحالی کی اس کوشش کی مکمل حمایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان نے امریکہ کی اس عرصے میں بھی دوسرے طریقے سے مدد کرنا شروع کی۔۱۹۶۹ میں یحییٰ خان کے دور حکومت میں پاکستان نے چین سے امریکہ کے تعلقات کی استواری میں ایک اہم کردار ادا کرنا شروع کیا تھا۔ لیکن سب سے اہم تبدیلی ۱۹۷۹ میں آئی جب امریکہ نے دوبارہ اس خطے میں اپنی پالیسیوں کو کامیاب ہونے کے لئے پاکستان کے کردار کو بڑا اہم سمجھنا شروع کردیا۔ یہ تبدیلی دو مختلف سمتوں میں ہو رہی تھی۔ ایک سمت وہ تھی جس میں پاکستان افغانستان کے اندر بڑا اہم کردار ادا کرسکتا تھا۔ اس صورتحال نے امریکہ اور چین دونوں کو اس بات پر سوچنے پر مجبور کیا کہ پاکستانی سرزمین کو روس کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے افغان بنیاد پرست گوریلوں کو منظم کرنے اور اس ساری کارروائی کو پاکستان کی طاقتور ایجنسی آئی ایس آئی (ISI) کے ذریعے کنٹرول کرنے کی منصوبہ بندی پر عمل شروع ہوا۔ اس کام کے عوض پاکستان کو نوازنے کے لئے فوجی امداد کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس کے علاوہ دوررس خارجہ پالیسی کے تحت پاکستان کے خلیج

فارس کے علاقے میں ممکنہ فوجی کردار نے اسے دوبارہ امریکہ اور مغربی قوتوں کے لئے اہمیت کا حامل بنا دیا اور جس کے باعث انھیں پاکستان کی اقتصادی اور فوجی امداد بحال کرنا پڑی۔ اسی وقت ایران میں شاہ ایران کی حکومت کا خاتمہ اور انقلاب ایران نے تمام صورتحال کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ امریکہ اور مغربی ممالک نے خلیج فارس اور مشرق وسطی میں سوویت یونین کے خلاف اپنی حکمت عملی میں ایران کو مرکزی مقام دیا ہوا تھا۔ انقلاب ایران نے ان کی تمام منصوبہ بندی کو ملیامیٹ کر دیا۔ اس نئی پالیسی کی بنیاد ۱۹۶۰ کی ان پالیسیوں پر بھی تھی جو کہ امریکہ نے اس علاقے میں براہ راست فوجی مداخلت کرنے کے لئے بنائی تھی اور اس کا اظہار امریکہ کے ساتویں بحری بیڑے کا بحر ہند میں داخل ہونا تھا جس نے سنگاپور سے لے کر نہر سوئس تک کے علاقے پر نظر رکھنا تھی۔ اس مقصد کے تحت علاقے میں امریکی بحریہ کی کاروائیوں کو مستحکم بنیادیں فراہم کرنے کے لئے مالدیپ سے ڈیگو گارشیا(Diego Garcia) کے جزائر کو زبردستی چھین کر برطانیہ کی مدد سے امریکہ کے حوالے کر دیا گیا۔۔Diego کا علاقہ گھوڑے کے جوتے کی شکل کی وہ اہم بندرگاہ تھی جو کہ پورے امریکی فوجی فلیٹ کو با آسانی محفوظ پناہ فراہم کر سکتی تھی۔ یہ بحر ہند کے سمندروں میں امریکی بحریہ اور سب میرین کے لئے آپریشن اور ترسیلات کی فراہمی کے لئے ایک اہم بیس بن گئی جس کی وجہ سے خلیج فارس کے علاقے کی کمزور حکومتوں کے دفاع کے لئے امریکی فوجی صلاحیتوں میں بڑا واضح اضافہ ہو گیا۔ امریکہ کی اس علاقے کے لئے بننے والی حکمت عملی کا اظہار مارچ ۱۹۸۰ میں بننے والی برق رفتار فوجی قوت (Rapid Deployment Force-RDF) کا وجود میں آنا تھا۔ RDF کو اپنے منصوبوں کو کامیابی سے آگے بڑھانے کے لئے فوری مدد کی ضرورت پڑ سکتی تھی جس کے لئے Diego کا اڈہ کافی دور پڑ سکتا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے امریکہ کے لئے سب سے زیادہ سودمند پاکستانی علاقہ اور خاص طور پر مکران کی ساحلی پٹی تھی جو کہ خلیج فارس سے بڑی قریب واقع تھی۔ پاکستان حکومتی سطح پر مکران کے ساحلی علاقوں میں امریکی اڈوں کی موجودگی سے انکار کرتا رہا ہے لیکن حکومتی دعوؤں کو جوبات مشکوک بناتی ہے وہ مکران کے ساحلی علاقوں میں فوج کی خفیہ تنصیبات کا لگایا جانا ہے۔ اس علاقے میں امریکی فوج کی تعیناتی کے موافق حالات موجود ہیں۔ جن میں ایک اہم بات مکران کے ساحلوں میں گہرے پانی کی بندرگاہ ہیں اور بندرگاہ کی موجودگی جو ایران کی حدود سے صرف ۵۰ میل دور واقع ہے۔ عام

شہریوں سمیت کسی کو بھی اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ اس علاقے تک سمندر یا زمینی راستے سے رسائی حاصل کر سکیں۔ اس سارے علاقے میں کچھ انتہائی حساس قسم کے فوجی آلات و تنصیبات کے نصب کئے جانے کا پاکستان کے دفاع سے کوئی تعلق نہیں۔ اس قسم کے حساس نوعیت کے فوجی آلات کے یہاں لگائے جانے سے فطری طور پر اس ساری صورتحال میں پاکستان بحیثیت متبادل (option) امریکہ کی علاقائی strategy میں اہمیت حاصل کر گیا۔ کونہم Kuniholm کے خیال میں " پاکستان کا بطور ایران کے متبادل امریکہ کے لئے کئی لحاظ سے سودمند ہے کیونکہ پاکستان کا بحیثیت اسلامی رجحان اسے مشرق وسطی کے عرب ممالک اور ترکی سے خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے اور یہ بات امریکہ کی مشرق وسطی کے لئے خارجہ پالیسی کے لئے بھی بہت سودمند ہے۔ یہ صورت امریکہ کے ترکی کے تعلقات برقرار رکھنے میں بھی مددگار ثابت ہو رہی ہے چونکہ ترکی اور پاکستان کے ایران کے ساتھ بڑے گہرے مراسم قائم ہیں"۔

کونہم Kuinholm اس موقع پر ایک اہم بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو کہ شاید سب سے اہم بات ہے وہ پاکستان کی اہم جغرافیائی محل وقوع کی اہمیت کو پوری طرح اجاگر کرنا تھا۔ امریکہ کی فوجی منصوبہ بندی اب امریکی Centcom کے ہاتھوں میں ہے جس کا دائرہ عمل خلیج فارس سے بحر ہند تک کے علاقے تک پھیلا ہوا ہے۔ Lifschultz جو کہ اس معاملے میں بہت گہری نظر اور معلومات رکھتے ہیں وہ Centcom کے نئے کردار کے بارے میں بڑی اہم معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اس کی معلومات کے مطابق امریکہ کو اب پاکستان کی تمام بیسوں (bases) تک با آسانی رسائی حاصل ہے اور امریکہ کو یہ تمام سہولیات پہنچانے کے باعث اب پاکستان امریکی امداد حاصل کرنے والا تیسرا بڑا ملک بن گیا ہے۔ وہ ایک امریکی اراکین کانگریس کو ۱۹۸۵ میں کانگریس کی دفاعی کمیٹی کو فراہم کی جانے والی معلومات کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ "جنرل کنگسٹن اور سینٹرل امریکی کمانڈر کا خیال ہے کہ پاکستان کو امریکی نیٹ ورک میں مکمل طور پر شامل کیا جائے جس کے اثرات پورے برصغیر پر پڑیں گے کیونکہ پاکستان Centcom کا ایک حصہ ہے"۔ P-3 ASW ہوائی جہاز اکثر پاکستان کی سرزمین استعمال کرتے ہیں اور اس صورتحال میں مزید سہولیات فراہم کرنے کے لئے پاکستان پر دباؤ بڑھ بھی سکتا ہے"۔ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ پاکستان اور امریکی تعلقات کا دوبارہ بحال ہونا دراصل مشرق وسطی میں مغربی

ممالک کے تیل کے مفادات کے تحفظ کے تناظر میں ہی ہے۔ پاکستان کو مغرب کے قریب جانے میں اس بار آسانی بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد حاصل ہوئی کیونکہ اب پاکستان کو مشرق وسطی میں مغرب کو کرائی گئی یقین دہانیوں کو پورا کرنے میں مشرقی پاکستان کی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا ورنہ اس سے قبل پاکستان کے حکمرانوں کے لئے مشرقی پاکستان کے رویوں کو اہمیت دینا ایک مجبوری تھی۔ ہندوستان اپنی طاقت اور قوت کے ساتھ ہمیشہ سے پاکستانی حکمرانوں کے لئے پریشانی کا باعث ہے اور ان نئی تبدیلیوں کے باوجود بھی ایسا نہیں لگتا ہے پاکستان جنوبی ایشیا کا حصہ نہیں رہے گا۔ پاکستان کا مشرقی سمت کی طرف جھکاؤ ہونے کے پس پشت دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ تاریخی حقائق بھی کارفرما ہیں۔ پاکستان جنوبی ایشیا کا حصہ صرف اس وجہ سے نہیں رہیگا کہ وہ اس خطہ کی مشترکہ زبان ثقافت اور مشترکہ میراث کا شریک دار ہے بلکہ امید ہے کہ مستقبل میں دوستانہ اقتصادی تعلقات کی بجائے سے یہ رشتے مزید مستحکم ہوں گے۔ پاکستان کے ہندوستان کے ساتھ تنازعات حل ہو جانے کی صورت میں پاکستان کا محور سیاسی، فوجی اور ممکنہ حد تک نظریاتی طور پر بھی مشرق وسطی سے زیادہ قریب ہو جائے گا۔

پاکستانی عورت بدلتے سماج میں

Pakistan: Women in a Changing Society

۱۹۸۰ کی دہائی حقیقی معنوں میں پاکستان میں خواتین کی دہائی کہی جاسکتی ہے۔خواتین کی ایک بھرپور اور طاقتور تحریک نے پاکستان کے سیاسی منظرنامے پر ایک ڈرامائی اثر ڈالا۔اس تحریک کی سب سے ٹھوس کامیابی جنرل ضیاءالحق کی ان پالیسیوں کے خلاف آواز اٹھانا تھا جو کہ وہ اسلام کے نام پر اس ملک میں خواتین کے خلاف نافذ کرنا چاہتے تھے۔اس دوران بہت ساری تنظیموں نے خواتین کے حقوق کی بحالی کی تحریک میں حصہ لینا شروع کیا جس میں وومن ایکشن فورم (Women Action Forum) بھی شامل تھا بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ WAF اس تحریک میں کلیدی کردار ادا کر رہی تھی جبکہ اس کے ساتھ ساتھ ڈیموکریٹک وومن ایسوسی ایشن، سندھیانی تحریک، آل پاکستان وومن ایسوسی ایشن APWA (جس کو قبل از سینئر بیوروکریٹس اور سیاستدانوں کی بیگمات چلاتی آئی تھی اور حکومت کی سرپرستی میں ایک اصلاح پسندانہ ایجنڈے پر سرکاری سرپرستانہ ماحول میں کام کرتی تھی) یہ تنظیمیں بھی احتجاج میں شریک ہوگئیں۔

۱۹۸۰ کی دہائی پاکستان میں خواتین کی سماجی حیثیت کی تنزلی کی بھی دہائی تھی۔ ضیاء حکومت نے اپنے اقتدار کو جواز فراہم کرنے کے لئے اسلام کے نام پر ایسے اقدامات اٹھانے اور قوانین بنانے کی کوششیں کیں جس کے باعث خواتین کے لئے ان کے قانونی حقوق، تعلیمی سہولیات اور ملازمتوں کے مواقعوں کے ساتھ ان کی آزادی حرکت اور مردوں سے تحفظ جیسے مسائل پیدا ہوگئے۔ان تمام اقدامات کے باعث خواتین نے اپنے حقوق کے دفاع کے لئے خود کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا۔مارشل لاء حکومت کے اقدامات، دعوؤں اور پروپیگنڈا کے نتیجے میں

ایک ایسا ماحول ترتیب پایا جس میں انتہا پسندوں کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے اور خواتین کو اسلامی قوانین کے مطابق لباس نہ پہننے اور سرِعام پھرنے پر ہراساں اور پریشان کرنے کی کھلی چھوٹ حاصل ہوگئی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ کام مذہب کے نام پر ہو رہا تھا۔ یہ قانون شکنی بغیر کسی پریشانی کے جاری تھی۔ خواتین کو نہ صرف اپنے آپ کو ریاستی اقدامات سے بچانا تھا بلکہ ان معاشرتی انتہا پسندوں سے بھی لڑنا تھا۔ ایسے حملے آج بھی جاری ہیں لیکن خواتین ان سے نبرد آزما ہیں۔

اس تبدیلی اور ترقی کو آزادی کے بعد گذشتہ چار دہائیوں کے دوران پاکستانی معاشرے میں آنے والی تبدیلی کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جنہوں نے خواتین کے سماجی مقام پر بڑا منفی اثر ڈالا ہے۔ اس مضمون میں ہم ملک کے دیہی اور شہری معاشرے میں آنے والی تبدیلیوں کا ذکر کریں گے لیکن زیادہ توجہ شہری معاشرے پر مرکوز رہے گی جہاں یہ تبدیلی زیادہ واضح تھی اور جہاں ان حکومتی اقدامات کو طاقتور طریقوں سے چیلنج کیا گیا۔

تاہم یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ چاہے دیہی معاشرہ ہو یا شہری پاکستان میں معاشرتی نظام بڑی سختی سے مردانہ ہے جہاں عورت ایک ''حاصل'' (acquired) اور ''قبضہ'' (given) کی گئی نجی ملکیت (chattel) تصور کی جاتی ہے چاہے یہ باقاعدہ شادیوں کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو جہاں عورت کو اپنی بقیہ زندگی مردانہ بالادست معاشرے میں مردوں کی خدمت کرتے گزارنا پڑتی ہے۔ عام طور پر خواتین کی شادی برادری کے اندر ہی کر دی جاتی ہے اور برادری کا نظام ہی عورت کی زندگی کے لئے قاعدے قانون مرتب کرتا ہے۔ باہمی تعاون کے برادری کے نظام میں برادری کی پنچایت بڑا اہم کردار حاصل کر لیتی ہے جو کہ عورت کی شادی اور اس کی بقیہ زندگی میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہے کہ خاندان کا سربراہ مرد اکیلے ہی فیصلے نہیں کرتا بلکہ مردوں کے اس معاشرے میں پورا معاشرہ عورت کے مقابل مرد ہی کا ساتھ دیتا ہے۔

کوئی عورت چاہے وہ شہروں میں کام کرنے والی خود مختار خاتون ہی کیوں نہ ہو اپنے گھر میں اپنی مرضی سے کسی عورت کو تحفظ "سایہ" بھی فراہم نہیں کر سکتی۔ ایک مطلقہ یا بیوہ عورت کو اپنے تحفظ کے لئے اپنی بقیہ زندگی کے دوران اپنے باپ یا بھائی کی طرف دیکھنا ہوتا ہے سوائے اس صورت میں کہ اس کے بالغ بیٹے ہوں جو اسے تحفظ فراہم کر سکیں اور جن کے ساتھ وہ رہ سکے۔ یہ چیز معاشرے میں عورت کو زیر دست لانے کا ایک انتہائی اہم عنصر ہے۔ عمومی طور پر ہی نہ صحیح لیکن پھر

بھی کئی مرتبہ معاشرے کے غریب افراد خصوصی طور پر شہروں میں بسنے والے کمی (kammis) یا "دیہی ملازمین" اپنی بیٹیوں کو دولت کے عوض فروخت کر دیتے ہیں۔ کئی موقعوں پر تو شوہر اپنی بیویوں کو طلاق دے کر فروخت کر دیتے ہیں۔ وہ خواتین جو مردوں کے اس فیصلے سے متفق نہ ہوں اس صورت میں بھی وہ اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں رکھتیں۔ انھیں مردوں کے اس فیصلے کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ ان مردوں کے لئے عورت ایک قیمتی چیز (valued object) ہے۔ وہ ایک قابل فروخت تحفہ ہے۔

آبادی کے شماریات (Demographic Statistics) پاکستانی معاشرے میں عورت کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے متعلق کافی تفصیلات فراہم کرتے ہیں۔ پاکستان شاید دنیا میں وہ منفرد ملک ہو جہاں مردوں کے مقابلے میں خواتین کی تعداد کم ہے۔ 1981 کی مردم شماری کے مطابق پاکستان میں ایک ہزار افراد کے مقابلے میں خواتین کی تعداد ۹۰۶ جبکہ بقیہ دنیا میں اوسطاً ۱۰۰۰ افراد کے مقابلے میں خواتین کی تعداد ۱۱۱ ہے۔ آبادی کے اس گروہ میں جس کی عمر ۴۰۔۱۵ سال کے درمیان ہے۔ اس گروہ میں خواتین کی اموات کی شرح مردوں کے مقابلے میں ۵۷ فیصد زیادہ ہے۔ جس کی ایک بڑی وجہ خواتین کو ملنے والی کم خوراک ہے جو کہ اب کی صحت پر برے اثرات مرتب کرتی ہے۔ عام طور پر خواتین کو کھانے کو بہت کم دیا جاتا ہے کہیں تو بچا کھچا ہی ان کا نصیب ہوتا ہے۔ اس کم خوراکی کی وجہ سے ان کا مدافعتی عمل کمزور ہو جاتا ہے۔ جس کے باعث ان کا کئی جان لیوا بیماریوں مثلاً ملیریا، سانس کی تکلیف، ٹی بی، پیٹ کے امراض وغیرہ کا شکار ہو کر بڑی کم عمری میں موت کا شکار ہو جانا عام سی بات ہے۔ حمل کی پیچیدگیوں اور زیادہ بچے پیدا کرنے کی وجہ سے خواتین کا مزید بیماریوں کا شکار ہو جانا بھی عام سی بات ہے۔ شہری علاقوں میں نچلے درمیانی طبقوں میں معاشرتی اور نفسیاتی مسائل اور چار دیواری کی قید و بند کی اضافی سختیاں ان خواتین میں گمبھیر مسائل کو جنم دینے کا باعث بنتی ہیں۔ ان بند گھروں میں وہ بمشکل سورج کی روشنی اور تازہ ہوا حاصل کر سکتی ہیں اور انہیں تفریح کا کوئی سامان مہیا نہیں ہوتا جبکہ ان کے مقابلے میں مردوں کو گھومنے پھرنے کی آزادی ہوتی ہے اور گھروں کی اس خستہ حالی کا مردوں پر شاید ہی اثر ہوتا ہو۔

پاکستان میں جب عورت کے اس استحصال اور ان کے ساتھ روا رکھے جانے والے غیر انسانی سلوک کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اس کی بہتری کے لئے مطالبہ کیا جائے تو پاکستان

کے مذہبی انتہا پسند اس پر واضح بات کرنے کے بجائے عورت کے بارے میں اسلام کے مثالی قوانین کی طرف توجہ مرکوز کرانا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مثالی نظام کا ذکر دراصل پاکستانی معاشرے کی خواتین کے اصل مسائل سے توجہ ہٹانا ہوتا ہے۔ اس لئے یہ اشد ضروری ہے کہ پاکستان میں خواتین کی سماجی صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے حقیقی حالات کو پیش نظر رکھا جائے۔ پاکستانی معاشرے میں کئی قسم کی تبدیلیاں (مثبت و منفی) آ رہی ہے جو ایک طرف جہاں عورت کی سماجی حیثیت کو بہتر کرنے کا باعث بن رہی ہیں تو دوسری طرف اس کے نتیجے میں ان کی سماجی حیثیت مزید بد سے بدتر بھی ہوتی جا رہی ہے۔

دیہی علاقوں میں عورت کی سماجی حیثیت اور کام کی تقسیم میں اس کا مقام اور کردار مختلف علاقوں اور طبقوں میں تبدیل ہوتا رہتا ہے اور ہر طرف ان تبدیلیوں کے بڑے گہرے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہاں پر صرف دو مثالیں دی جائیں گی۔ پہلی مثال شمال مغربی پنجاب کا پوٹھوہاری علاقہ ہے۔ اس علاقے میں کام کرنے والی عمر کے بیشتر افراد فوج میں ملازمت کے حصول کے باعث اپنے گاؤں چھوڑ چکے ہوتے ہیں یا پھر پاکستان کے مختلف علاقوں میں فیکٹریوں اور کارخانوں میں کام کرنے کے باعث علاقے سے دور رہتے ہیں بلکہ بعض حالات میں تو یہ لوگ مشرق وسطی، برطانیہ اور یورپ کے کئی ممالک میں ملازمت کے لئے مصروف عمل ہیں اور ان ممالک کے قوانین یا معاشی مجبوریوں کی وجہ سے اپنے خاندانوں کو ساتھ نہیں رکھ سکتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے خاندان کے افراد اپنے آبائی علاقوں میں رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ جس کے باعث اس علاقے کے کئی دیہاتوں میں تو انتہائی غیر معمولی صورتحال کا سامنا ہے۔ بیشتر افراد یا تو بوڑھے ہو چکے ہیں یا پھر ان افراد میں بچے اور خواتین شامل ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ ان علاقوں میں خواتین کو دوہرے کام کرنا پڑتے ہیں۔ گھر کے اندرونی کاموں کے علاوہ زمینوں کی دیکھ بھال اور کسی حد تک معاشی بوجھ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔

اس کے مقابل پنجاب کے نہری اور نسبتاً خوشحال اضلاع میں زرعی / سبز انقلاب کے نتیجے میں خواتین کھیتی باڑی زراعت کے شعبے سے علیحدہ ہو کر پردے میں مقید ہو گئی ہیں۔ اس تبدیلی سے کچھ دہائیوں قبل تک سوائے چند جاگیردار خاندانوں کے، باقی خواتین زراعت کے شعبے میں بڑا اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ وہ بیج بونے، فصل کی دیکھ بھال سے لے کر اس کی کٹائی تک کے

مراحل میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتی تھیں۔ یہ ان کے کام میں شامل تھا کہ جانوروں کے لئے چارہ لائیں اور ان کی دیکھ بھال کریں۔ اس طرح یہ خواتین پردے میں مقید نہیں ہوتی تھیں بلکہ انہیں کسی حد تک آزادی سے گھومنے پھرنے کی سہولت بھی میسر تھی۔ ایک اور رسم جو کہ انہیں کسی حد تک اقتصادی آزادی مہیا کرتی تھی وہ کپاس کی چنائی تھی لیکن اب ہونے والی ترقی کے نتیجے میں اس کا خاتمہ ہوتا جارہا ہے۔ اس کام سے منسلک خواتین کو اس کی ادائیگی اجناس کی صورت میں کی جاتی ہے۔ اپنی محنت کے نتیجے میں ان کو ملنے والی کپاس ان کی محنت کا مکمل بدل نہیں ہوتی۔ لیکن پھر بھی یہ ان کی ذاتی ملکیت ہوتی ہے جس پر مرد ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ کپاس کی چنائی کے بعد یہ مناظر عام دیکھے جاسکتے ہیں کہ خواتین اپنے سروں پر کپاس کے ٹوکرے اٹھائے مارکیٹوں میں خریداری کے لئے گھومتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ کئی مواقعوں پر اس پر کپاس کے بدلے (Barter) کے ذریعے اشیاء خریدی جاتی ہیں اور خواتین کے لئے یہ خوشی کا لمحہ ہوتا ہے کے ایسے موقع پر اپنے شوہر کی اجازت کے بنا اپنے اور اپنے بچوں کے لئے پسند کی چیزیں خرید سکتی ہیں۔ سبز انقلاب کے بعد ۱۹۷۰ کی دہائی میں بہت سے نسبتاً خوشحال کسانوں نے اپنی خواتین کو کھیتوں میں کام کرنے سے ہٹا کر انھیں گھر کی چار دیواری میں مقید کرنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے معاشرے میں اپنے لئے بہتر سماجی رتبہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پنجاب کے دیہاتوں میں تحقیق کرتے ہوئے میں اور میری بیگم اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر چہ اس تبدیلی نے عورت کو اضافی کام سے آزادی دی ہے لیکن وہ اس تبدیلی سے خوش نہیں ہوئی۔ کئی خواتین نے میری بیوی کو اس نئی صورتحال کو جیل میں قید ہونے کے مترادف قرار دیا۔ ان کے خیال میں اس طرح خواتین کو ان کی تھوڑی سی اقتصادی آزادی اور گھومنے پھرنے سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔ جب کوئی فرد اس تبدیلی کے اثرات کا جائزہ لینا چاہے تو اس کو عورت کی محنت کے استحصال (Exploitation) اور عورت کے ساتھ ہونے والی زیادتی (Oppression) کے درمیان تفریق ضرور کرنا چاہئے۔ یہ بات تو مسلمہ ہے کہ عورت پر سے محنت کا بار (بیشک) بڑی معمولی سطح تک ہی سہی کچھ حد تک کم بہر حال ہوا ہے لیکن ان پر ظلم و زیادتی بڑی حد تک بڑھ گئی ہے۔ خواتین بھی اس تبدیلی کو اپنے حقوق سے محرومی سے تعبیر کرتی ہیں۔

اس کے مقابلے میں شہری علاقوں میں خاندانی معیشت میں خواتین کا کردار گذشتہ ۴۰ برسوں کے مقابلے میں بڑی حد تک بڑھ چکا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ان تبدیلیوں کے اثرات

بالائی طبقوں اور محنت کش طبقوں کے مقابلے میں نچلے درمیانی طبقوں کے خاندانوں پر گہرے ہیں۔ پاکستان کے شہروں میں محنت کش طبقے کی ایک بڑی تعداد کا تعلق ان مہاجرین محنت کشوں پر مشتمل ہے جو ملک کے شمالی علاقے سے نکل کر اب ملک کے بڑے شہروں میں ذریعہ معاش سے منسلک ہیں جبکہ ان کے خاندان اب بھی اپنے گاؤں دیہاتوں میں رہائش پذیر ہیں۔ ہم ان محنت کشوں کے متعلق بہت ہی کم جانتے ہیں جو کہ تنہا شہروں میں رہائش پذیر ہیں اور نہ ہی ان کے خاندانوں سے متعلق کسی قسم کی تفصیلات سے آگاہی حاصل ہے جو کہ اب بھی دیہاتوں میں رہائش پذیر ہیں۔ اس کے مقابلے میں وہ محنت کش ہیں جو اپنے خاندان کو اپنے ساتھ شہروں میں رکھتے ہیں ان کی خواتین اکثر غیر رسمی معاشی نظام (Informal economy) کے تحت کارخانوں اور فیکٹریوں میں غیر فنی (unskilled) یا پھر غیر رسمی معاشی نظام کے تحت گھروں میں ملازمت کے پیشے سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ اکثر خواتین گھریلو کاموں کے مقابلے میں کارخانوں کی ملازمت کو ترجیح دیتی ہیں جس کی شاید ایک وجہ بہتر تنخواہ ہو۔ اس کے باوجود کہ خواتین دوہرے کام کر کے اپنے خاندان کی معاشی آمدنی میں اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کرتی ہیں، حالیہ دنوں میں عدالتوں کے مقدمات میں پیش ہونے والی گواہیوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عورت آج بھی مردانہ معاشرے میں استحصال کا بہت بری طرح شکار ہے۔

اس کے مقابلے میں بالائی خوشحال طبقوں کی خواتین کے مسائل بالکل دوسری نوعیت کے ہیں۔ ان کے گھروں پر کام کے لئے ملازمین بھی مہیا رہتے ہیں اور ان پر ملازمت کرنے کا کوئی دباؤ بھی نہیں ہوتا اور کئی مراحل پر تو انہیں ملازمت کرنے کی بھی اجازت بھی نہیں ملتی۔ ان خواتین کو اپنے شوہروں پر مکمل انحصار کرنا پڑتا ہے اور انھیں اس بات کا بھی خوف لگا رہتا ہے کہ ان کے خوشحال شوہر کسی بھی مرحلے پر دوسری بیوی لا سکتے ہیں۔ اپنی انفرادی حیثیت نہ بنانے کے باعث اور کوئی ملازمت اختیار نہ کرنے کی وجہ سے یہ خواتین اپنے لئے کوئی آزادانہ ماحول نہیں بنا سکتیں اور انھیں بیشتر مواقعوں اپنے خاندان کے سربراہ یا شوہر پر کلی طور پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ درحقیقت ان کی حیثیت اس غلام سے زیادہ نہیں ہوتی جسے بہت اچھی طرح کھلایا جائے، نفیس لباس پہنایا جائے اور زر و جواہرات سے سجا دیا جائے لیکن ان تمام آسائش کے باوجود وہ کلی طور پر اپنے شوہر کے رحم و کرم پر ہوں۔ جہاں پر شوہر چاہے ان کے ساتھ جتنی بھی زیادتی اور بدتمیزی کرے انھیں

ان کے ساتھ ہی رہنا ہوتا ہے۔ سماجی قیدو بند کے باعث بعض اوقات پیشہ ورانہ خواتین کو کئی قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس کے مقابلے میں نو دولتیوں (new Rich) میں برادری کے اندر کی خاتون کے ساتھ شادی بیاہ کا رواج ہے جو چاہے زیادہ پڑھی لکھی اور فیشن ایبل نہ ہوں اس قسم کی شادیاں کسی حد تک روایتی شادیوں کے زمرے میں آجاتی ہیں۔ اس روایتی شادی کے ساتھ ساتھ نو دولتیے بعدازاں ایک ایسی پڑھی لکھی مہذب اور خوبصورت خاتون کی تلاش میں رہتے ہیں جو کہ اس کے دوستوں، ساتھیوں، کاروباری افراد اور بیوروکریٹس کے لئے ایک اچھی میزبان اور ان کی بہتر خاطر مدارت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ پہلی بیوی پرانے جوتے کی طرح بے وقت ہو جاتی ہے۔ وہ طلاق حاصل کرنے کی جرأت نہیں کرسکتی کیونکہ وہ کہیں اور جانے کا سوچ ہی نہیں سکتی اس کے پس پشت وہ معاشرتی خوف حائل ہوتا ہے جس میں ایک مطلقہ عورت کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور شادی کی ناکامی کے لئے بھی اسے ہی مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ لیکن وہ خواتین خوش نصیب کہی جاسکتی ہیں جن کے جوان بیٹے ہوں اور وہ اپنی ماں کا خیال کرتے ہوئے اس کے لئے علیحدہ گھر اور رہائش کا انتظام کرسکیں لیکن عام بالائی طبقے کی خواتین اپنی زندگیاں پریشانی اور غیر محفوظ ماحول میں گزارتی ہیں۔ یہ صورت حال کتنی عام ہے اس کا اندازہ لگانا ذرا مشکل ہے۔

مغرب کے بالمقابل پاکستان میں اب بھی خاندانی روایات کی معاشرے پر بڑی گہری گرفت ہے اور ان کی خلاف ورزی معیوب بات سمجھی جاتی ہے۔ جس پر بعض اوقات سزا کا سامنا بھی کرنا پڑجاتا ہے لیکن امراء اور بااثر طبقے جو کہ شہروں کے بلادالعروس (cosmopolitan) ماحول میں رہتے ہیں۔ ان پر پابندیاں کوئی خاص اثر نہیں ڈالتیں عام طور پر خیال یہ کیا جاسکتا ہے کہ نچلے طبقوں کے مرد حضرات دوسری شادی کی طرف کم مائل ہوتے ہیں لیکن اس کے پس پشت دراصل وہ معاشی مسائل ہوتے ہیں جس کے باعث وہ بیک وقت دو بیویوں کے بوجھ کے متحمل نہیں ہوسکتے اور مزید اپنے لئے الجھنیں پیدا کرنا نہیں چاہتے۔

نچلے درمیانی طبقے کے خاندانوں میں ہم دو قسم کی تقسیم دیکھ سکتے ہیں ایک وہ خاندان ہیں جن کی خواتین نسبتاً پڑھی لکھی ہیں اور 'عزت دار' نوکری حاصل کرنے کی بھی اہل ہیں جبکہ دوسری طرف وہ روایتی خاندان ہیں جن کی خواتین نے بہتر تعلیم حاصل نہیں کی اور کوئی 'عزت دار' نوکری

حاصل کرنے کے اہل بھی نہیں۔ پہلے قسم کی خواتین اپنی تعلیم کی بنیاد پر ملازمتیں حاصل کر لیتی ہیں جبکہ دوسرے قسم کے کیس میں خواتین گھروں میں کام کرنے یا پھر چھوٹے کارخانوں میں اپنی محنت فروخت کرنے پر مجبور ہوتی ہیں جہاں اکثر و بیشتر ان کی محنت کو بڑے سستے معاوضے کے عوض استحصال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے پاکستانی معاشرے کو اسلامائز کرنے کے عمل سے سب سے زیادہ متاثر پہلی قسم کی خواتین ہوئیں اور بالآخر انھوں نے ہی ان اقدامات کے خلاف ۸۰ کی دہائی میں احتجاجی تحریک شروع کی۔ پاکستانی معاشرے میں آنے والے بحرانوں کی بنیادی وجہ گزشتہ ۴۰ برسوں کے دوران نچلے یا نچلے درمیانی طبقے کے بڑھتے ہوئے مسائل ہیں۔ آزادی کے وقت یہ ایک عمومی تاثر تھا کہ مرد خاندان کی کفالت کا کُلی طور پر ذمہ دار ہوگا اور مشترکہ خاندانی نظام کو فوقیت دی جاتی تھی جس کی اہم وجہ اقتصادی وجوہات تھیں۔ مشترکہ خاندان میں خاندان کا سربراہ اس کے بھائی، بیٹے، پوتے سب مل کر کام کرتے تھے اور خاندان کی ضرورت پوری کرتے تھے۔ اس خاندانی نظام کی عورت گھریلو محنت کے بوجھ تلے دب کر خاندان کی اقتصادی مدد کرنے کے قابل نہیں رہتی تھی۔ یہ بات یقیناً کہی جاسکتی ہے کہ شہری نچلے درمیانی طبقے کی خواتین سب سے زیادہ دباؤ کا شکار تھیں۔ یہ خواتین پردے، چادر اور چار دیواری کی پابندی کا بری طرح شکار رہتی ہیں۔ اس کے مقابل گاؤں دیہاتوں میں رہائش پذیر خواتین جو کہ پردہ نشین ہونے کے باوجود نسبتاً آزادی سے دوسری خواتین سے رابطے کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں اور یقیناً یہ رابطے انھیں کئی مواقعوں پر ضروری مدد بھی فراہم رتے رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح قدیم شہروں کے پرانے علاقوں "محلوں" میں رہنے والی خواتین بھی اس سہولت سے فائدہ اٹھا سکتی تھیں لیکن پاکستان کے تیزی سے بڑھتے ہوئے شہروں میں پرانا سماجی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔ ان حالات میں شہروں کے نچلے درمیانی طبقے کی خواتین حقیقی معنوں میں اپنے گھروں میں مقید ہو کر رہ گئی ہیں۔ نئے حالات میں انھیں اپنے رشتہ داروں اور دوستوں سے ملاقاتوں کے لئے ذرائع آمد ورفت کی ضرورت پڑتی ہے۔ پاکستان میں پچھلی کئی دہائیوں سے بڑھتے ہوئے افراط زر کے باعث روزمرہ کے اخراجات میں بڑی حد تک اضافہ ہو گیا ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں خاندان کے کفیل مردوں کی آمدنی اس رفتار سے نہیں بڑھی۔ اب آمدنی روزمرہ کی ضروریات پورا کرنے کے لئے تقریباً ناکافی ہے اس لئے اس بات کا شدید دباؤ ہے کہ خاندان کی آمدنی کو بڑھانے کے

لئے دیگر ذرائع کو مزید وسعت دی جائے جس کی وجہ سے آہستہ اور دھیرے دھیرے زیادہ سے زیادہ خواتین مجبور ہوگئیں کہ وہ ملازمت کے نئے ذرائع تلاش کرتے ہوئے اپنے خاندان کا معاشی بوجھ کم کریں۔ یہ تبدیلی بڑی واضح اور اہم ہے۔ ابتدائی طور پر چند پیشے ہی ایسے 'باعزت' سمجھے گئے جہاں پر یہ خواتین کام کرسکتیں تھیں لیکن جلد ہی ملازمتوں کی کمی اور محنت کشوں کی زیادتی کی وجہ سے "عزت دار ملازمت" کا تصور دھیرے دھیرے وسیع ہوتا چلا گیا اور اب اس میں بہت ساری دیگر ملازمتیں بھی شامل ہوگئی ہیں۔ ابتدائی طور پر اعلیٰ پائے کی ملازمتوں خاص طور پر معالج، تدریسی پیشہ (خاص طور پر طالبات کی درسگاہیں وغیرہ میں شامل تھیں) انہیں عزت دار ملازمت سمجھا جاتا تھا اور اسی لئے ڈاکٹر اور اسکول اساتذہ کی ایک تہائی تعداد خواتین ملازمین پر مشتمل تھیں لیکن دھیرے دھیرے اس میں تبدیلی آئی اور عزت داری کے دائرے میں کلیریکل ملازمتیں بھی شامل ہوگئیں۔ جہاں خواتین دفاتر میں مردوں کے ساتھ ملازمت کرتی تھیں۔ ان ملازمتوں میں معاون خاص (پرائیویٹ سیکریٹری) کی ملازمت کو بڑی شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن اس پیشے سے منسلک خواتین کی تنخواہیں نسبتاً زیادہ بہتر تھیں جس کی وجہ ملازم کا اپنے آجر سے بڑا قریبی ہونا تھا۔ لیکن اس میں بھی اب نسبتاً تبدیلی آ گئی ہے۔ آج خواتین کو مختلف شعبوں میں کام کرتے دیکھا جاسکتا ہے جس میں لیبارٹری اسسٹنٹ، ریلوے اسٹیشن کا ٹکٹ کلکٹر، پوسٹ آفس کے کلرک سے لے کر وکیل، آرکیٹیکٹ، انجینئر، صحافی اور ٹی۔وی اور ریڈیو پر کام کرنے والے شعبے بھی شامل ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کے ان شعبوں میں خواتین کی تعداد نسبتاً کم ہے لیکن حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ تنخواہ دار ملازمتوں میں خواتین کے زیادہ آنے اور ثانوی تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے نئی اقتدار جنم لے رہی ہے۔ اب خواتین تیزی سے ملازمتیں حاصل کررہی ہیں اور بالائی طبقوں کی خواتین صرف اقتصادی مجبوریوں کی وجہ سے ملازمت حاصل کرنے پر ہی مجبور نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی انفرادی شناخت کے لئے بھی لڑ رہی ہیں۔

تعلیم عزت دار اور معاشرے کے قابل قبول شعبوں ملازمتوں کے حصول کے لئے بنیادی عنصر ہے۔ نچلے درمیانی طبقے کی ناخواندہ خواتین کے لئے کسی عزت دار ملازمت کا انتظام کیا جانا ناممکنہ بات میں سے ہے۔ اس لئے یہ خواتین گھروں یا چھوٹے کارخانوں میں محنت کرنے پر مجبور ہوتی ہیں اور ان شعبوں سے منسلک خواتین کے لئے بنیادی ضرورت تعلیم نہیں جبکہ اس کے مقابلے

میں وہ خاندان جو کہ اپنی خواتین کو درس وتدریس یا دفتری ماحول میں کام کرنے یا دیگر کام کرنے یا بہتر ملازمتوں سے منسلک کرنا چاہتے ہیں اب وہ خواتین کی تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے بالکل اسی طرح اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلوا رہے ہیں جیسا کہ اپنے لڑکوں کو۔ ایک وہ بھی وقت تھا جب خواتین کی تعلیم کو وقت اور پیسے کا ضیاع سمجھا جاتا تھا لیکن اب خواتین کی تعلیم کے لئے دباؤ بڑھتا چلا جارہا ہے اور کئی پیشہ ور مرد پڑھی لکھی خواتین سے شادی کرنے کو ترجیح دیتے ہیں چاہے وہ بہت زیادہ پڑھی لکھی نہ ہو۔ اس کے ساتھ ایک اور تصور بھی ہے جس کے تحت عورت اپنے شوہر سے زیادہ پڑھی لکھی (Over qualified) ہو بیشتر اوقات وہ ایسے رشتوں میں نقصان میں ہی رہتی ہیں۔ ایسے رشتے اکثر اوقات بعد ازاں ناکام ہو جاتے ہیں خاص طور پر اس ماحول میں جہاں شوہر اور بیوی ایک ہی جگہ کام کر رہے ہوں مثلاً درس وتدریس کا شعبہ اور وہاں بیوی اپنی قابلیت کی بنیاد پر ترقی کرتے ہوئے شوہر سے آگے نکل جائے تو اس صورت میں مرد کی جھوٹی انا کو شدید دھچکا لگتا ہے۔ اس صورتحال میں عورت اپنی ازدواجی زندگی کو بچانے کے لئے قربانی دینے کو تیار ہو جاتی ہے کیونکہ شادی کی ناکامی کی صورت میں اسے بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ تمام تر کوششوں کے باوجود کچھ شادیاں بالآخر ناکامی پر ہی اختتام پذیر ہوتی ہیں۔

اس بدلتی ہوئی سماجی صورتحال اور نچلے درمیانے طبقے کے خاندانوں میں خواتین کی بڑھتی ہوئی خواندگی اور ملازمتوں سے منسلک ہو جانے کے باعث گھریلو اقتصادیات میں خواتین کے بڑھتے ہوئے کردار کو جنرل ضیاء الحق کی اسلامی بنیاد پرستانہ پالیسیوں سے خاندان کے اقتصادی نظام اور تبدیل ہوتی ہوئی اقدار اور رویوں کو شدید خطرہ لاحق ہو چلا تھا۔ بڑی حد تک بڑھ گیا۔ اس لئے اکثر اوقات ان خاندانوں نے اسلام کے جدیدیت اور روشن خیالی کے فلسفے کو اپنانے پر ترجیح دی۔ یہ خاندان بنیاد پرست ملاؤں کے قدامت پرستانہ اسلامی نظریات کے بارے میں شاکی ہو گئے۔ پاکستان میں سماجی اور سیاسی زندگی میں سیکیولر خیالات کے لئے بڑی وسیع گنجائش موجود ہے جس کی عکاسی ۱۹۸۵، ۱۹۸۷ (بلدیاتی انتخابات) اور پھر ۱۹۸۸ کے انتخابات میں جماعت اسلامی جیسی بنیاد پرست جماعتوں کی بری طرح شکست تھی۔

اس کے باوجود پاکستان میں ایسے کئی نچلے درمیانی طبقے کے خاندان ہیں جہاں خواتین کو ایسی تعلیم سے آراستہ نہیں کیا گیا جو کہ انھیں "باعزت" تنخواہ دار ملازمتیں مہیا کر سکے۔ روایتی طور

پر ایسی خواتین گھریلو کام کاج سے ہی منسلک رہ جاتی ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ خواتین کے لئے روزگار کے دیگر ذرائع کھلتے چلے جا رہے ہیں۔ اب ایسی فیکٹریاں بھی ہیں جہاں صرف خواتین ہی مصروف عمل ہیں خاص طور پر تیار شدہ ملبوسات کی تیاری، اسی طرح کپڑوں کی سلائی اور finishing jobs سے منسلک شعبے ہیں۔ بد قسمتی کی بات یہ ہے کہ ان پیشوں سے وابستہ خواتین کو ان کی اجرت ان کی محنت کے مقابلے میں بڑی کم ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس طبقے کی محنت کش خواتین کا استحصال ان کے گھر یعنی چادر و چار دیواری کو چھوڑے بغیر ایک اور طریقے سے بھی کیا جاتا ہے جس کے تحت انھیں ان کے گھروں پر خام مال پہنچا دیا جاتا ہے اور تیار شدہ مال بعض اوقات ان کے گھروں سے وصول کر لیا جاتا ہے طویل گھنٹوں تک سخت محنت کرنے کے باوجود ان محنت کش خواتین کو اس رقم کا عشر عشیر تک نہیں ملتا جو کہ فیکٹریوں یا کارخانے میں جا کر کام کرنے والی خواتین کو ملتا ہے۔ لیکن وہ خواتین جو کہ خاندانی مجبوریوں کی وجہ سے اپنے گھروں سے باہر نہیں نکل سکتیں وہ مجبوراً ہی سہی اسی قسم کے کام کو فوقیت دیتی ہیں۔

ایسے کیسز میں ہمیں دو رجحانات (patterns) دیکھنے کو ملتے ہیں۔ حالانکہ اس کے لئے ہمارے پاس کوئی ٹھوس اعداد و شمار موجود نہیں جس کی بنیاد پر کسی ایک کی دوسرے پر اہمیت ثابت کر سکیں۔ پہلے طریقہ کار میں خاندان کے مرد سربراہ کارخانے کے مالکان کے ساتھ گفت و شنید کر کے مال کی تیاری کے آرڈر گھر لے آتے ہیں اور بعد از محنت تیار مال کارخانے پہنچا کر محنت کش خواتین کا پیسہ خود ہڑپ کر جاتے ہیں حقیقی معنوں میں اس قسم کی خواتین اپنے شوہروں کے لئے غلام/لونڈی سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ یہ اپنے خواتین اپنے مردوں کے رحم و کرم پر چھوڑی گئی۔ وہ ان خواتین کے ساتھ غلاموں جیسا بھیانک سلوک کرتے ہیں اور انھیں اس کام کے لئے دقیانوسی خیالات رکھنے والے تنگ نظر مُلّاؤں کی مکمل حمایت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اپنے دل کی تسلی کے لئے یہ مرد حضرات ان خواتین کو جو کہ اپنے گھر سے باہر نکل کر کارخانوں اور دیگر جگہوں پر کام کرتی ہیں ان کے بدکردار ہونے اور ان کے اس عمل کو غیر شرعی کہنے سے بھی باز نہیں آتے اور اپنی چار دیواری میں محبوس خواتین کو باکردار اور پاکدامن سمجھتے ہیں کیونکہ انھیں گھر سے باہر نکل کر 'غیر محرم' افراد سے رابطہ نہیں کرنا پڑتا۔ دیکھا جائے تو نظریاتی طور پر اسلام کی بنیاد پرستانہ تعبیر عورت کے اوپر مرد کی حاکمیت تسلیم کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور طریقہ کار بھی

رواج پذیر ہے جس کے تحت چھوٹے کارخانوں کی خواتین ایجنٹ کارخانے کے قریبی علاقوں کی کچی آبادیوں میں گھوم پھر کر محنت کے آرڈر اور مال تقسیم کرتی ہیں اور پھر اس تیار شدہ اشیاء کو اکٹھا کر کے یہ خواتین ایجنٹ ان محنت کش خواتین کو ان کا معاوضہ براہ راست پہنچا دیتی ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے کام پر اب تک کوئی باقاعدہ تحقیق نہ ہونے کی وجہ سے کسی تصدیق شدہ اعداد و شمار کی عدم دستیابی کے باعث یہ کہنا مشکل ہے کہ اس قسم کے تعلق سے محنت کش عورت کو کس قدر فائدہ پہنچتا ہے۔ زرینہ بھٹی (Zareena Bhatty 1981) الہٰ آباد کی بیڑی بنانے والی خواتین پر ایک تحقیقی کام کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ خواتین اپنے گھر کا ۴۵ فیصد سے زیادہ بوجھ برداشت کرتی ہیں جس کی وجہ سے خاندانی معاملات میں ان کا کردار بڑا اہم ہو جاتا ہے یعنی پیسے کی بنیاد پر ان کی بات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن بھارت کے ایک مسلمان دیہی معاشرے میں کی گئی تحقیق کا پاکستان کے نچلے درمیانی شہری خاندانوں سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں پر کئی ایسے مسائل ہیں جو کہ پاکستان کے سماجی تناظر میں مزید سائنسی بنیادوں پر تحقیق کے متقاضی ہیں۔

گھر میں مقید محنت کش خواتین خود کو باہر جا کر کام کرنے والی خواتین کے مقابلے میں اس لئے بہتر سمجھتی ہیں کہ وہ گھر میں رہتے ہوئے کام کرنے کی وجہ سے مذہبی تعلیمات سے انحراف کرنے کا باعث نہیں بنتی۔ ان کے خیال میں وہ گھر میں رہ کر اخلاقی اقدار کی بہتر طور پر پاسداری کر سکتی ہیں۔ گھروں میں مقید ہونے والی ان خواتین پر مرد حضرات با آسانی اپنا حکم چلا سکتے ہیں بالمقابل ان خواتین کے جو کہ گھروں سے باہر نکل کر محنت کرتی ہیں۔ ان خواتین کو عوامی احتجاجی جلسوں میں بھی شریک کیا جاسکتا ہے لیکن یہ مرد اس موقع پر بھی ان مجبور خواتین کو مکمل طور پر برقعے اور پردے میں باہر نکالتے ہیں اور وہ سر سے پاؤں تک اپنے آپ کو ڈھانپے رکھتی ہیں۔ یہ خواتین مردوں کے ان دقیانوسی خیالات کی مکمل تائید کرتی ہیں کہ خواتین کا گھر سے باہر نکل کر کام کرنا بڑی حد تک شرمناک اور غیر شرعی عمل ہے۔ ان خواتین کے اپنے اندر اور وہ مرد حضرات جو کہ ان خواتین کی زندگیوں پر مکمل بالادستی رکھتے ہیں ان کے ذہن میں یہ خیالات پختہ گھر کر لیتے ہیں کہ عورت کے لئے سب سے بہتر جگہ اس کے اپنے گھر میں ہے۔

نچلے درمیانی طبقے کی محنت کش خواتین کو تنخواہ دار ملازمتوں کے دوران کئی اقسام کے دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان محنت کش خواتین کے دن کا آغاز بہت پہلے ہو جاتا ہے ایسی محنت کش

خواتین کو کام پر جانے سے پہلے اپنے شوہر کو کھانا کھلا کر اور اپنے بچوں کو اسکول بھیج کر بڑے قلیل وقت میں بھاگ دوڑ کر اپنے جائے ملازمت تک پہنچنا ہوتا ہے۔ ملازمت کی جگہ پہنچنا بذات خود ایک جنگ کرنے کے مترادف ہے۔ خاص کر پاکستان میں جہاں بڑے شہروں میں (مثلاً کراچی، لاہور وغیرہ) جہاں نقل و حرکت میں پبلک ٹرانسپورٹ بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے وہ انتہائی فرسودہ اور تکلیف دہ ہے۔ کئی بڑی کمپنیاں خواتین محنت کشوں کو آمدورفت کے لئے ٹرانسپورٹ کی سہولت فراہم کرتی ہیں لیکن اس معاملے میں بھی وہ خاتون جو کہ سب سے پہلے بس میں سوار ہو اور پھر واپسی پر اسے سب سے آخر میں اتارا جائے اسے اضافی طور پر کئی گھنٹے بلا مقصد ضائع کرنا پڑتے ہیں۔ وہ یقیناً گھر تھک کر ہی پہنچتی ہے جبکہ اس کا شوہر اس وقت پنکھے کے نیچے بیٹھ کر ٹھنڈے مشروب سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہے۔ جبکہ اس کی تھکی ہاری بیوی کو فوراً باورچی خانے میں جا کر خاندان کے افراد کے لئے رات کا کھانا تیار کرنا پڑتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسکول سے آئے ہوئے بچوں سے ان کی ضروریات معلوم کرنا اور کھانا کھلانے سے فارغ ہو کر انھیں سلانا بھی ہوتا ہے۔ اس طویل کام کی وجہ سے ان خواتین کو گھر کی صفائی اور کپڑوں کی دھلائی جیسے کام ہفتہ وار چھٹی کے لئے رکھ چھوڑنا پڑتے ہیں اور پھر ان بدقسمت خواتین کی ہفتہ وار چھٹی آرام کرنے کی بجائے ان بچے ہوئے کاموں کو جلد از جلد ختم کرنے پر خرچ ہو جاتی ہے۔ اس قلت وقت کی وجہ سے اکثر محنت کش خواتین کے پاس کسی میٹنگ، جلسے اور مظاہروں میں باوجود خواہش رکھنے کے شرکت کرنے کے مواقع ہی نہیں بچتے۔ حالانکہ یہ خواتین دلی طور پر ان تنظیموں اور ان کے مقاصد کے ساتھ بھرپور ہمدردی رکھتی ہیں۔ لیکن ان کے مقابلے میں چند ایسی خوش قسمت خواتین بھی ہیں جن کے سیاسی نظریات رکھنے والے شوہر یا پھر مثبت رویہ رکھنے والی ساس (Mother in law) انھیں تھوڑی سی آزادی یا سہولتیں فراہم کرنے پر رضامندی کا اظہار کرتی ہیں۔ عام طور پر صرف وہ خوشحال خواتین جو کہ اپنے گھروں پر ملازمین رکھ سکتی ہوں صرف وہ ایسی سرگرمیوں میں حصہ لے سکتی ہیں۔ اس مرحلے پر ذرائع آمدورفت بھی ایک بہت بڑی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ وہ خواتین جو کہ اپنی نجی گاڑیاں رکھتی ہیں وہ با آسانی آ جا سکتی ہیں جبکہ وہ خواتین جن کے پاس یہ سہولت نہ ہو، خواہشمند ہونے کے باوجود شرکت کرنے سے محروم رہ جاتی ہیں پاکستان جیسے مردانہ معاشرے میں لفٹ لے کر پہنچنا ایک معیوب بات سمجھی جاتی ہے۔

اپنی کئی مجبوریوں کے باعث نچلے درمیانی طبقے کی ملازمت پیشہ خواتین کسی تحریک میں کوئی بھرپور اور نمایاں کردار ادا نہیں کرسکتیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں لینا چاہئے کے وہ خواتین شعور سے عاری ہیں یا پھر پاکستان میں خواتین کے مسائل سے ناواقف ہیں۔ان کی شعوریت کا اندازہ لگانے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ان کے ساتھ چند لمحے گذارے جائیں جس کے نتیجے میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ محنت کش خواتین ان معاملات میں اپنا بڑا واضح موقف رکھتی ہیں۔ان حالات میں اکثر تنظیموں کی رہنمائی خوشحال خاندانوں کی ایسی خواتین کو حاصل ہو جاتی ہے جو کہ ملازمین، گاڑی اور دیگر سہولیات رکھ سکتی ہوں اس لئے یہ خوشحال خواتین باقی ماندہ محنت کش خواتین کے رویوں اور ان کے مطالبات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ان خوشحال خواتین کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے جبکہ ان کی دیگر بہنیں اپنی مجبوریوں کی وجہ سے کام میں ہی الجھی رہتی ہیں۔

اس لئے پاکستان میں خواتین کی تحریک ان پڑھی لکھی خواتین کے گرد گھومتی ہے جو کہ پیشہ ورانہ ملازمت سے وابستہ ہیں اور ان میں کئی تنخواہ دار ملازمین بھی ہیں۔جنرل ضیاءالحق کے دور میں سرکاری طور پر خواتین کی تحریک کو بدنام کرنے کے لئے اس تحریک کو مغرب زدہ اور انگریزی زبان بولنے والی بالائی طبقے کی خواتین سے منسلک کردیا گیا جن کے ذہن باہر سے برآمد شدہ خیالات سے پُر ہیں اور جن کا پاکستان کی خواتین سے کوئی حقیقی تعلق نہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ خواتین کی تحریک سے وابستہ بیشتر کارکن کئی بیوروکریٹس، سیاسی رہنماؤں اور صحافیوں کے مقابلے میں محنت کش خواتین کے بہت قریب ہوتے ہیں۔یہ لوگ ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں اور ان کے مسائل بہتر طریقے سے سمجھتے ہیں۔خواتین کی تحریک میں حصہ لینے والی کئی کارکن اس کام میں نو وارد ہونے کے باوجود اپنے آپ کو بہتر طور پر منظم کرکے اس تحریک میں رہنمائی کا کردار ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس نئے اور غیر مانوس کام کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے انھوں نے کئی مواقعوں پر اعلیٰ قیادت کا مظاہرہ کیا۔نا صرف لچکدار اور جدت پسندی بلکہ ذاتی جرات کا مظاہرہ بھی کیا۔یہ آخری خصوصیت خاص طور پر ودمن ایکشن فورم (WAF) کے اراکین میں خصوصی طور پر نظر آتی ہے۔ضیاءالحق کے دور حکومت کے اقدامات نے خود وہ حالات پیدا کئے جس کی وجہ سے اس تحریک کو مزید بڑھاوا ملا اور جس کی وجہ سے پاکستان آج بھی کئی دہائیاں گذرنے کے بعد بھی کئی مسائل کا شکار ہے۔۱۹۸۰ کی دہائی میں خواتین کی تحریک کے اچانک ابھر کر سامنے

آنے کی وجہ جنرل ضیاءالحق کا اسلام کے نام پر اپنے اقتدار کو طول اور اپنی حکمران کو قانونی یا اخلاقی جواز فراہم کرنے کے لئے اٹھائے گئے اقدامات تھے۔خواتین کے خلاف اٹھائے گئے اقدامات کا اصل مقصد و منشا پاکستانی معاشرے میں عورت کو بے عزت کرنے اور قانونی حقوق سے محروم کرنے اور عورت کی تعلیم کے حصول، اس کی آزادی حرکت اور پیشہ ورانہ کام میں رکاوٹیں حائل کرنا تھا۔
جنرل ضیاءالحق کے دور حکومت میں جہاں دیگر قوانین میں تبدیلیاں کی گئی ہیں وہیں ۱۹۸۴ میں اہم تبدیلی قانون شہادت میں تبدیلی تھی جس کا مطلب مروجہ قانون شہادت کو اسلامی قانون کے مطابق بنانا تھا۔سوائے حدود آرڈیننس ۱۹۷۹ جو کہ (جو کہ اسلامی سزاؤں کے متعلق عام تھا) اپنے اندر شہادت کا ایک واضح طریقہ کار متعین کرتا تھا۔نئے قانون شہادت کے تحت دو مرد شاہدوں کی غیر حاضری میں ایک مرد اور ایک عورت کی شہادت جرم ثابت کرنے کے لئے ضروری ہوگی۔جبکہ اس قانون اور دیگر قانون نے ایک مرد کو دو خواتین کے برابر کر دیا مثلاً قصاص اور دیت کے قوانین کے تحت قتل یا زخمی کئے جانے کی صورت میں ملزمان زیادتی کا شکار بننے والے فرد یا اسکے خاندان کو معاوضہ ادا کر کے سزا سے بچ سکتے ہیں۔اس قانون کو اسلامی نظریاتی کونسل نے تجویز کیا اور ضیاءالحق کی مقرر کردہ مجلس شورہ نے منظور کیا۔قصاص و دیت کے معاملے میں بھی مرد کے مقابلے میں عورت کے لئے ادا کئے جانے والا معاوضہ اس رقم کا آدھا تھا جو کہ ایک مرد کے ہلاک یا زخمی ہونے کی صورت میں ادا کیا جاتا۔ان قوانین نے (جنھوں نے عورت کی حیثیت مرد سے نصف کر دی)۔ان اقدامات نے ملک میں خواتین کی تحریک کو حرکت میں لانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔
ان متعصبانہ قوانین نے جہاں ایک طرف خواتین کی حیثیت مرد کے مقابلے میں نصف کر دی وہیں اس کے ساتھ ہی جنرل ضیاء کی پالیسیوں نے پیشہ ورانہ شعبوں سے منسلک کام کرنے والی خواتین کی زندگیوں کو بھی پُر خطر بنا دیا۔ایک طرف جہاں ان قوانین کے خلاف خواتین کے پُر تشدد مظاہرے اور شدید احتجاج پہلی نظر آئے وہیں ایک اہم خطرہ مستقبل میں خواتین کے حصول تعلیم کے متعلق بھی پیدا ہو گیا تھا۔عمومی طور پر جنرل ضیاءالحق کے دور میں بنائے گئے قوانین اس بات پر زور دیتے ہوئے بنائے گئے تھے کہ کسی طرح خواتین کو گھر سے باہر نکل کر کسی بھی سرگرمی میں حصہ لینے سے مختلف حیلوں بہانوں سے روکا جائے اور ان کو اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرنے کے مواقع کم سے کم دیئے جائیں۔

مثال کے طور پر ایسے منصوبے بھی زیر غور تھے جن کا مقصد خواتین کے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے مواقعوں کو مکمل طور پر بند کرنا تھا۔ شاید اس کی سب سے اہم مثال خواتین کو صرف خواتین جامعات کے حدود میں مقید کرنا تھا۔ جنرل ضیاء الحق کے جامعات کو مالی مہیا کرنے والے ادارے University Grants Commission کی طرف ایک دی جانے والی تجویز کے مطابق خواتین کے گھریلو اقتصادیات (Home Economics) پڑھانے کے کراچی، لاہور اور پشاور یں واقع تین کالجز کے رتبوں کو بلند کر کے انھیں خواتین کی یونیورسٹی کا درجہ دینے کا اعلان کیا گیا لیکن جو بات سب سے اہم تھی وہ ان مجوزہ جامعات میں کہ خواتین کو صرف وہی علوم پڑھائے جانے کا منصوبہ تھا جو کہ طالبات کو بہتر مثالی گھریلو عورت (Ideal House Wife) بنانے میں مددگار ثابت ہوں۔ تعلیم کا یہ محدود تصور خواتین کو وسیع تر تعلیم کے حصول سے مکمل طور پر علیحدہ کر دیتا تھا جو کہ انھیں تعلیم، ملازمت، کاروبار یا انڈسٹری میں اپنا کردار ادا کرنے سے روکتا تھا۔ اس سلسلے میں کئی رکاوٹیں مثلاً خواتین کے لئے میڈیکل یا سائنسی مضامین میں داخلے کے لئے مردوں کے مقابلے میں زیادہ نمبروں کی حصول شرط تھی۔

اس کے ساتھ ہی خواتین کے کھیلوں پر حصہ لینے پر بھی قدغن لگائی گئیں۔ پاکستانی خواتین کو ہاکی اور ایتھلیٹکس کے تین بین الاقوامی مقابلوں میں شرکت سے روک دیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق کے وفاقی وزیر برائے کھیل نے اس پابندی کی وضاحت کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ خواتین کو صرف ان کھیلوں میں حصہ لینے کی اجازت دی جا سکتی ہے جہاں تماشائی یا تو صرف خواتین ہوں یا پھر ان خواتین کے ''محرم مرد''۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اخبارات میں اس رپورٹ کو شائع کرتے ہوئے لفظ ''محرم'' کو ''خونی رشتہ دار'' سے تبدیل کر دیا گیا جو کہ بالکل غلط تشریح تھی۔ اسلامی رشتوں کی تقسیم میں ''محرم'' کا مطلب وہ رشتے ہیں جن سے خواتین کو شادی کرنے کی اجازت نہیں۔

اسلامی نقطہ نظر سے 'محرم' کی تعریف میں خاتون کے بچے یا ان کے بچے اور کئی فقہوں میں بہنوں کے شوہر تک شامل ہیں[1]۔ مثلاً چچازاد یا تایازاد بھائی کسی بھی عورت کے لئے "محرم" نہیں لیکن وہ رشتہ دار ضرور ہے۔ 'محرم' کی تعریف یقیناً کھیل میں حصہ لینے والی عورت کھلاڑی کے لئے الگ ہے جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ تماشائیوں میں کسی بھی صورت مردوں کو شامل ہونے کی

اجازت نہ دی جائے۔ جنرل ضیاء الحق کے نئے قوانین کے مطابق عورت کو صرف باپردہ ہوکر کھیلوں میں شریک ہونے کی اجازت دی جاسکتی تھی۔ یہ فضول اور جاہلانہ قوانین مذہب کے نام پر رائج کرکے خواتین کی مثبت صلاحیتوں کو ضائع کرنے کے برابر تھے۔ عریانی اور فحاشی کے خلاف جہاد کے نام پر ضیاء الحق حکومت نے سرعام گھومنے والی خواتین کے خلاف ایک باقائدہ مہم کا آغاز کردیا اور ملک میں ایک ایسا ماحول پیدا کیا گیا جس میں خواتین کے خلاف حملے ایک عام بات ہوگئی اور انھیں مذہب کے نام پر جائز بھی قرار دے دیا گیا۔ ان مہموں کو زیادہ تر مُلّاؤں اور جرائم پیشہ افراد نے بڑے زور و شور سے چلایا جو کہ عورت کو اخلاقیات کے نام پر تکلیف دے کر نفسیاتی تسکین حاصل کرتے تھے۔ ضیاء الحق دور حکومت میں سرکاری ملازمت سے وابستہ اسکولوں اور کالجوں میں کام کرنے والی خواتین اساتذہ کو "اسلامی" لباس اور پھر برقعہ پہننے کے احکامات جاری کئے گئے۔ ان مہموں کے نتیجے میں ان خواتین کو خاص طور پر ہدف بنایا گیا جو پاکستان میں اخلاقیات کے نام پر مردوں کی بالادستی کے خلاف سرگرم عمل تھیں۔ اسلام کے نام پر خواتین کے خلاف تشدد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اسلام کی حمایت میں لگائے گئے نعروں اور حقیقی صورت حال کی منافقت اَن گنت واقعات سے بہت جلد عیاں ہوگئی جہاں خواتین کی ناکوں کو کاٹا گیا اور انھیں برہنہ کرکے سرعام پریڈ کرائی گئی (تاکہ انھیں سبق سکھایا جاسکے)۔ ان واقعات کے خلاف بڑھتے ہوئے شدید غم و غصے کے باعث ضیاء الحق حکومت نے ان واقعات میں ملوث لوگوں کے خلاف کاروائی کرنے کا اعلان کیا لیکن اس کی نام نہاد "اسلامی" حکومت نے ان جرائم کے مرتکب افراد کے خلاف حقیقی معنوں میں کوئی سنجیدہ قدم نہ اٹھایا۔ نہ ہی حکومت نے عوام میں شعور و آگاہی پیدا کرنے کے لئے ایسے اقدامات اٹھانے کی زحمت کی جن کے ذریعے انھیں شرم دلائی جاسکے۔ آج بھی خواتین کے خلاف ایسے واقعات اور جرائم جاری ہیں۔

ضیاء الحق حکومت نے حدود آرڈیننس چند جرائم کی سزا کو اسلامی اصولوں کے مطابق بنانے کے لئے جاری کیا جس میں کئی وحشیانہ سزائیں مثلاً ہاتھوں کا کاٹا جانا اور سنگسار کرنا شامل تھا۔ ملک میں یہ بحث اور تکرار جاری رہی کہ یہ سزائیں واقعی اسلام کے اصولوں کے مطابق ہیں حالانکہ ان سزاؤں پر مکمل طور پر عمل تو نہ ہوسکا لیکن یہ بات واضح تھی کہ ایسے احکامات کا جاری کیا جانا بھی علامتی طور پر نہ صرف اہم تھا بلکہ پورا وقت ملا ان احکامات کو نافذ کرنے کے لئے بھرپور مطالبات

کرتے۔ لیکن سرعام کوڑے مارنے والی سزاؤں پرعمل درآمد کیا گیا یہ سزائیں نہ صرف کھلے مقامات اور بڑے مجمع کی موجودگی میں دی گئیں بلکہ انکی سرکاری ٹی وی کے ذریعے تشہیر بھی کی گئی اور انکے یہ نعرے بھی سنوائے گئے کہ " حرام زادوں" (Bastard) کو اور زور سے مارو ایسے مناظر یقیناً انتہائی شرمناک اور تذلیلی عمل تھے۔ لیکن جو قانون ہمارے اس عنوان سے براہ راست تعلق رکھتا ہے وہ زنا (حدود کا نفاذ آرڈیننس) تھا جو کہ فروری ۱۹۷۹ میں نافذ کیا گیا۔ اس آرڈیننس نے رشتہ داروں اور دیگر مردوں کے ہاتھوں خواتین کے خلاف اور خاص طور پر شہری طبقے کی غریب خواتین کے خلاف تشدد اور زیادتیوں کے لئے نئی بنیادیں فراہم کیں۔ حد تو یہ تھی کہ اس آرڈیننس نے خواتین کو تحفظ دینے کے بجائے انہیں مزید اس خوف میں مبتلا کر دیا کہ زنا بالجبر کی شکار خاتون بھی اپنے خلاف جنسی تشدد کے خلاف شکایت کرنے سے بھی گھبرانے لگی کیونکہ انھیں خوف تھا کہ بجائے ظلم کرنے والے مرد کو سزا دی جائے۔ ان مظلوم خواتین کو خود مورد الزام ٹھہرایا جا سکتا تھا۔

اس آرڈیننس نے خواتین کے خلاف مرد کے ہاتھ میں زنا کے نام پر ایک ایسا ہتھیار فراہم کر دیا جس کے تحت اب زنا بالرضا (Adultery) کو ریاست کے خلاف ہونے ہونے والے جرائم کی فہرست میں شامل کر دیا گیا جس پر پولیس بلا روک ٹوک خواتین کے خلاف کاروائی کرنے کی مجاز قرار پائی۔ اس سے قبل معاملات ایسے نہ تھے۔ اس وقت جنسی تعلق (adultery) ایک ذاتی جرم تھا جو کہ کسی بھی صورت میں پینل جرم کی تعریف میں نہ آتا تھا۔ اب عورت پر تہمت بازی آسان ہو گئی ہے خاص طور پر ان واقعات میں جہاں خواتین اپنے شوہروں سے کسی بھی وجہ سے علیحدگی چاہتی ہوں ان کیسز میں مرد حضرات کے لئے یہ بات بڑی سہل ہے کہ وہ پولیس میں جا کر اپنی بیوی کے خلاف زنا کے الزامات لگا کر درخواست دے دیں اور پولیس انھیں باآسانی گرفتار کر کے قید کر سکتی ہے پولیس کی بدعنوانی اور عدالتوں میں مقدموں کی طوالت کے باعث ایسے مقدمات کو نمٹانے میں سالوں لگ جاتے ہیں اور اس تمام عرصے میں سب سے زیادہ پریشانی اور تکلیف کا سامنا عورت کو ہی کرنا پڑتا ہے جو کہ بعض اوقات قانونی مراحل طے کئے بغیر ہی واجب سزا قرار پاتی ہے۔ ان مقدمات میں بھی شوہر کے پاس یہ حق ہے کہ وہ اپنی بیوی پر الزام لگانے کے باوجود اس کی ضمانت دے سکتا ہے اور اگر وہ یہ کام کر لے تو پھر وہ خاتون کلی طور پر اپنے شوہر کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ وہ اسے ہر وقت پریشان کرتا رہتا ہے اور اس کی ضمانت واپس لینے کی

صورت میں اس کو دوبارہ جیل جانا پڑ سکتا ہے درحقیقت ایسے قوانین کے نتیجے میں عورت کی حیثیت ایک غلام سے بھی بدتر ہو کر رہ گئی ہے۔ پاکستان کی نامور خاتون قانونی ماہر اور انسانی حقوق کے کمیشن کی سیکریٹری عاصمہ جہانگیر کا خیال ہے کہ اب یہ مرد حضرات کے لئے بڑی آسان بات ہو گئی ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے خلاف جو ان سے علیحدگی چاہتی ہوں زنا کا الزام لگا کر ان کو گرفتار کروا دیں۔ یہ سلسلہ پسند کی شادیوں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے جہاں والد اپنی بچی کو پسند کی شادی کی اجازت نہیں دینا چاہتے۔ ایسے واقعات میں اکثر لڑکی کے والدین اس کے شوہر پر اغواء کا مقدمہ کر کے انھیں زنا کے جرم کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے ان کے خلاف ایف آئی آر کٹوا دیتے ہیں اور جوڑے کو اس جرم سے بچنے کے لئے قانونی نکاح نامہ پیش کئے بغیر چھٹکارا پانا ممکن نہیں ہوتا۔ زنا آرڈیننس نے جنسی زیادتی کا شکار بننے والی خواتین کو انتہائی محرومیت* (Catch 22) کی حالت میں لا کر کھڑا کیا ہے۔ جس میں زنا بالرضا اور زنا بالجبر (Rape) دونوں کو ایک ہی قانون کے تحت لا کھڑا کیا ہے۔ اس قانون کی دوسری اہم بات وہ طریقہ شہادت ہے جو اس آرڈیننس میں وضع کیا گیا ہے۔ اس قانون کے تحت زنا بالجبر (rape) بھی جنسی عمل قرار دیا گیا ہے جو کہ چاہے اس جرم کا شکار ہونے والے کی رضامندی یا رضامندی کے بغیر (چاہے موت کے خطرے پر) ہی کیوں نہ سرانجام دیا ہو۔ اس قانون میں زنا بالجبر کی سزا سنگسار کرنا یا بعض اوقات اس سے تھوڑی سی کم سزا یعنی تعذیر عائد کرنا ہے۔ اس سزا کے لئے شہادتوں کا ہونا ایک نہایت ضروری عنصر ہے جس کی سب سے پہلی صورت گنہگار کا جرم قبول کرنا ہے (ایک غیر شادی شدہ عورت کا حمل ٹھہر جانا اس کا ایک واضح ثبوت ہے)۔ یا پھر چار بالغ مردوں کا عدالت میں شہادت کے لئے پیش ہونا جن پر عدالت کو یہ اطمینان ہو کہ یہ صادق اشخاص ہیں جو خود گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے ان چار افراد کا سزا عائد کرنے کے لئے شہادت دینا ضروری ہے۔ اس قسم کی شہادت کا عام حالات میں پایا جانا تقریباً ناممکن ہے سوائے عرب کے وسیع و عریض صحراؤں میں اس لئے مردوں کو زنا بالجبر کی صورت میں قابل گرفت لانا نہایت مشکل ہے اس لئے ایسے واقعات کی تعداد بھی بہت بڑھ چکی ہے اور

(* Catch-22 ایک انتہائی مغربی اور نسبتاً تازہ اصطلاح ہے جس کا استعمال Joseph Heller نے اپنے ناول Catch-22 میں کیا جو کہ ۱۹۶۱ میں شائع ہوا جس کا مفہوم و مطلب انتہائی بے کسی اور مجبوری کو ظاہر کرتا ہے۔ مترجم)

جرم کے مرتکب ملزمان بلاخوف وخطر آزادی سے گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ظلم تو یہ ہے کہ اس قانون میں عورت کے اپنے ذاتی بیان کی کوئی اہمیت ہی نہیں اور نہ ہی اس کی درخواست کی شنوائی۔ اگر وہ زنا بالجبر کی شکایت (جس کو قانون کے تحت وہ ثابت ہی نہیں کر سکتی) کرے تو اسی وقت یہ بات تسلیم کر لی جاتی ہے کہ وہ زنا کی مرتکب ہو چکی ہے اس لئے ایسے کیس میں یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس عورت نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہے اور وہ اس جنسی عمل میں کسی بھی مرد کے ساتھ اپنی مرضی سے شریک ہوئی ہے اور اس کی وجہ سے اسے قانون کے تحت بڑی کڑی سزا کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے۔اس قانون سے عورت کو چھٹکارا تو کیا نصیب ہو وہ مزید مشکلات کا شکار ہو جاتی ہے۔ زنا آرڈیننس کے تحت خاتون کئی صورتوں میں ظلم کا شکار ہو سکتی ہے۔خواتین کو اس قانون سے پہنچنے والے نقصان کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۸۰ کی دہائی میں عاصمہ جہانگیر کے صرف ملتان کی جیل کی قیدی خواتین سے کیے گئے انٹرویو interview سے یہ پتا چلتا ہے کہ جیلوں میں ۴۰ فیصد قید خواتین کے مقدمات کا تعلق حدود آرڈیننس سے تھا بیشتر خواتین کا تعلق قلیل آمدنی والے غریب خاندانوں سے تھا۔انٹرویو کی گئی ۳۷ خواتین میں سے ۱۶ خواتین کی خاندانی آمدنی صرف ۵۰۰ روپے ماہانہ (جو کہ ایک تنہا محنت کش کی مزدوری کے برابر ہے) اور کسی بھی خاندان کی آمدنی ۳۰۰۰ روپے (دفتر میں کام کرنے والے کلرک کی ماہانہ تنخواہ) سے زیادہ نہ تھی۔اخبارات میں ان واقعات اور مقدمات کی بھی بڑی عجیب طریقے سے تشہیر کی جاتی ہے۔قلت جگہ کی وجہ سے ہم صرف چند مثالوں کا ذکر کریں گے جن میں خواتین کو مختلف طریقوں سے موردالزام ٹھہرایا گیا۔

سب سے بدنام زمانہ کیس ۱۸ سالہ تقریباً نابینا لڑکی صفیہ بی بی کا ہے جو کہ ایک نہایت ہی غریب کسان کی بیٹی تھی جسے اس کے والدین نے ملازمت کی غرض سے ایک مقامی زمیندار کے گھر پر گھریلو کاموں کے لئے رکھوایا تھا۔اس لڑکی کو اس کے آجر کے بیٹے نے زبردستی زیادتی کا نشانا بنایا اور بعدازاں زمیندار نے خود بھی یہی حرکت دوہرائی جس کے نتیجے میں وہ لڑکی حاملہ ہو گئی اور اس کا غیر قانونی پیدا ہونے والا بچہ اپنی پیدائش کے فوراً بعد وفات پا گیا۔لڑکی کے والد نے پولیس میں زنا بالجبر کی رپورٹ درج کرائی تو عدالت نے زمیندار اور اس کے بیٹے کو حدود آرڈیننس میں دی گئی طریقہ شہادتوں کا فائدہ دیتے ہوئے باعزت بری کر دیا۔اس قانون کے تحت اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کو ثابت کرنے کے لئے اس مظلوم لڑکی کو چار پاک دامن مردوں کی گواہی پیش کرنا

ضروری تھا جو کہ وہ کسی صورت نہیں کر سکتی تھی، اور مزید زیادتی یہ کہ وہ نابینا لڑکی اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کو نہ ثابت کرنے کی وجہ سے زنا کی مرتکب پائی گئی جس کی گواہی اس کا حاملہ ہونا تھا اس جرم کی سزا میں اسے ۳ سال جیل، سر عام ۱۵ کوڑوں کی سزا ملی اور ۱۰۰۰ روپے کا جرمانہ بھی عائد کیا گیا اور مزید یہ کہ کورٹ نے یہ سزا دیتے ہوئے لکھا کہ اس کو نرم سزا دینے کی وجہ اس کی کم عمری اور اس کی معذوریت تھی اس واقعہ نے WAF کو اپنی مہم کو مزید پُر زور طریقے سے شروع کرنے کا موقع فراہم کیا عوام کے بڑھتے ہوئے احتجاج کے نتیجے میں ضیاء الحق کو اس معاملے میں مداخلت کرنے اور شریعت کورٹ کو اس معاملے کا از خود نوٹس (suo moto) لینا پڑا ایک غیر معمولی روشن خیال اور لبرل جج نے اس بنا پر اس سزا کو کالعدم قرار دیا کہ عدم ثبوت کی بناء پر جب مُرد کو شک کا فائدہ دیا جا سکتا ہے تو وہی فائدہ عورت کے لئے بھی ہونا چاہئے لیکن اس کے باوجود اس لڑکی کے ساتھ ظلم کرنے والوں کو عدالت کے کٹہرے میں نہیں لایا جا سکا۔

ایک اور کیس جس میں شوہر یا اس کے رشتہ دار کس طرح قانونی طور پر عورت کو ہراساں اور پریشان کر سکتے ہیں اس کی مثال اس وقت سامنے آئی جب ایک ۲۵ سالہ خاتون شاہدہ نے اپنے شوہر خوشی محمد سے طلاق حاصل کی طلاق نامہ پر شوہر کے دستخط کرنے کے بعد مجسٹریٹ نے بھی تصدیق کر دی۔ قانون کے مطابق یہ کارروائی ہو گئی لیکن اس قانون کی ضروریات کے مطابق مزید یہ کہ طلاق دینے والے شوہر کو ان کاغذات کو مقامی کونسل کے پاس بھی اندراج کرانا ضروری ہے جو کہ اس نے نہیں کیا۔ جس کے پس پشت شعوری کوشش بھی ہو سکتی ہے۔ جس کا مقصد اپنی سابقہ بیوی کو پریشان کرنا بھی ہو سکتا تھا۔ شاہدہ نے قانون اور شریعت کے مطابق ۹۰ دن کی عدت گذارنے کے بعد اپنے والدین کی رضامندی سے ایک اور شخص محمد سرور سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا سابقہ شوہر خوشی محمد طلاق دینے کے باوجود اس بات پر بضد ہو گیا کہ وہ شاہدہ سے دوبارہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کے انکار پر اس نے یہ اعلان کیا کہ وہ اسے کسی اور سے دوسری شادی کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ شاہدہ کی دوسری شادی کے بعد اس نے اس کے خلاف عدالت میں زنا کا مقدمہ درج کرا دیا۔ عدالت میں پیشی کے دوران شاہدہ نے اپنی طلاق کے کاغذات جس میں خوشی محمد کے دستخط اور مجسٹریٹ کی تصدیق شامل تھی پیش کیا لیکن عدالت نے ان کاغذات کو ماننے سے انکار کر دیا کیونکہ ان کا مقامی کونسل میں اندراج نہ ہو سکا تھا اس لئے

عدالت نے یہ فیصلہ دیا کہ طلاق کا اطلاق نہیں ہوسکتا تھا اس لئے ثانوی شادی غیر قانونی تھی۔

کیونکہ عدالتی کارروائی کے دوران شاہدہ اور اسکا شوہر سرور اس بات کا اقرار کر چکے تھے کہ وہ بطور شوہر بیوی کے طور پر زندگی گزار رہے ہیں اس لئے عدالت نے ان کو حدود آرڈیننس کے تحت زنا بالرضا کا مرتکب قرار دیتے ہوئے ان کے خلاف کارروائی کا حکم دیا اور دونوں کو سنگسار کے ذریعے ہلاک کرنے کا حکم دیا۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ خواتین کی تحریک کے پُرزور احتجاج کے نتیجے میں بالآخر اس بھیانک سزا کے خاتمے کا اعلان کیا گیا لیکن بدقسمتی سے اس بہیمانہ قانون سے ہر ایک کو با آسانی چھٹکارا حاصل نہیں ہوسکتا۔ کئی والدین پسند کی شادیوں کی مخالفت شاید اس لئے بھی کرتے ہیں کہ اس شادی کے نتیجے میں اپنی اس حاصل ہونے والی رقم سے محروم ہونے کا خدشہ بھی ہوتا ہے جو وہ اپنی بیٹی کو شادی کی صورت میں فروخت کر کے حاصل کر سکتے ہیں (پاکستان میں لڑکی کی شادی کے عوض رقم وصول کرنا عام روایات ہیں)۔ ایسے والدین عام طور پر دولھے کے خلاف اپنی بیٹی کے اغواء کا مقدمہ درج کر دیتے ہیں۔ اسی طرح لڑکی کو شادی کے بعد سسرال میں رہنے کے باوجود بھی اس کے والدین اغواء کے مقدمات میں پھانس دیتے ہیں۔ پولیس ایسے مقدمات میں قانونی اور شرعی طور پر شادی شدہ جوڑے کو گرفتار کرنے کے لئے کوششیں شروع کر دیتی ہے اور ان کے نہ ملنے کی صورت میں لڑکے کے خاندان کے دیگر افراد کو بطور یرغمال گرفتار کر لیتی ہے۔

ان تمام مقدمات کی وجہ سے نہ صرف متعلقہ لوگ جو ان معاملات سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں، متاثر ہوتے ہیں۔ بلکہ عمومی طور پر پاکستان میں خواتین کی حیثیت مجروح ہوتی ہے۔ اور خواتین اپنے ظالم اور لالچی والدین کی خواہشات کے آگے خوف و قانون کی پابندیوں کے باعث سر جھکا لیتی ہیں۔ بدقسمتی سے جنرل ضیاء الحق کے ۱۱ سالہ نام نہاد اسلامائزیشن کے عمل نے پاکستانی معاشرے کو انتہائی عدم برداشت کا معاشرہ بنا دیا ہے۔ اس ثقافت نے سب سے بڑھ کر یہ کہ عورت کو قانونی پیچیدگیوں میں الجھانے کے ساتھ ساتھ بے وقت اور بے عزتی کا سامنا کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ حدود آرڈیننس کے باعث اسے غیر انسانی رویوں اور بہیمانہ سلوک کا سامنا ہے۔ حکومت نے ذرائع ابلاغ کے تمام ذرائع کو لوگوں کو اسلام کے اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کی تبلیغ اور ترغیب کے لئے استعمال کرانا شروع کیا لیکن افسوس یہ ہے کہ ان تمام قوانین کی توضیح

جنرل ضیاء الحق کے اپنے اور اس کے تنگ نظر مُلّاؤں کے خیالات ے مطابق ی صیاء اس ے ان اقدامات کا ایک مزید تباہ کن کام اس کی لوگوں سے وہ اپیل تھی کہ نہ صرف وہ زندگی اسلام کے مطابق گزاریں بلکہ اس بات کو بھی یقینی بنائیں کہ ان کے پڑوس کے لوگ بھی اس بات پر کار بند رہیں اور یہ ذمہ داری ان افراد نے اٹھالی جو کہ نام نہاد مذہب کے حمایتی بن بیٹھے اور کسی بھی بہانے عورت کو بے عزت کرنے سے بعض نہیں رہتے تھے۔ کئی مواقع پر تو یہ کام بالکل انجان لوگوں نے سرانجام دیا مثال کے طور پر خاور ممتاز اور فریدہ شہید (Mumtaz and Shaheed, 1987: 71) ایک ایسے قصہ کا حوالہ دیتے ہیں کہ جس میں جب لاہور کے ایک فیشن ایبل علاقے میں بالائی طبقے کی ایک خاتون بیکری میں داخل ہوئی تو ایک انجان شخص نے اس کو اس بات پر تھپڑ رسید کیا کہ وہ اپنا سر ڈھانپے ہوئے نہ تھی اور اس ملک کا سب سے تشہیری اور بھیانک واقعہ وہ تھا جب جمعہ کی نماز ختم کر کے نکلنے والے نمازیوں نے مسجد کی قریبی کچرا دانی میں ایک نومولود زندہ بچے کو اس مسجد کے پیش امام کی قیادت میں سنگ باری کر کے ہلاک کر دیا جو کہ ان کے خیال میں ایک غیر قانونی جنسی تعلق کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔ اس قسم کے بھیانک واقعات کے رونما ہونے کے پس پشت یقیناً جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں ہونے والا پروپیگنڈہ تھا جس نے معاشرے میں عدم برداشت اور رجعت پسندی کو فروغ دیا۔

اس تمام صورت حال میں اس بات کی امید تھی کہ بے نظیر بھٹو کی جمہوری حکومت ایسے قوانین کو واپس کر دے گی اور خصوصی طور پر حدود آرڈیننس (بشمول زنا آرڈیننس)۔ لیکن ایک سال گذر جانے کے باوجود حکومت نے ایسا کوئی عندیہ نہیں دیا ہے کہ وہ ملک میں ان قوانین کی تبدیلی کے لئے کوئی سنجیدہ اقدام اٹھانا چاہتی ہے یقیناً اس کے پس پشت نہایت پیچیدہ سیاسی مسائل بھی ہیں جس کی وجہ سے حکومت مفلوج (paralsis) ہو کر اس معاملے میں کچھ کرنے سے قاصر ہے۔ ہم اس بات کی تفصیل میں یہاں نہیں جانا چاہتے۔ ان وجوہات کی بناء پر جنرل ضیاء الحق کا بھیانک سیاسی ورثہ (legacy) اسی طرح جاری ہے جس کے باعث پاکستانی عورت کا مستقبل غیر یقینی اور مزید پُر خطر نظر آتا ہے۔

حوالہ جات

Ahmad, Shahnaz 1983 "Women's Movement in Pakistan" Alavi, Hamza 1972 Kinship in West Punjab Villages' Contributions to Indian Sociology, New Series. Vol.VI (for a fuller account see Hamza Alavi, 'The Two Biraderis- Kinship in Rural Punjab' in T. N. Madan (ed) Muslim Societies in South Asia, 2nd edition. New Delhi 1995)

Bhatty, Zarina 1981 The Economic Role and Status of Women in the Beedi Industry in Allahabad, India, ILO, World Employment Programme, Vol 63

Mumtaz, Khawar and Shaheed, Farida 1987 Women of Pakistan Zed Press, London various Pakistan Law Digest.

خلافت تحریک کے تضادات/تاریخ کے الجھاوے

(Ironies of History / Contradiction of Khilafat Movement)

۲۴-۱۹۱۹ کے درمیان شروع ہونیوالی "خلافت" تحریک کی اب تک واحد اور منفرد بات یہ ہے کہ اسے اسلامی نظریہ سازوں، ہندوستانی قوم پرستوں، کیمونسٹوں اوران کے ساتھ ساتھ مغربی دانشوروں نے ایک ساتھ مل کر اس تحریک کو بڑھا چڑھا(Glorified) کر اسے ہندوستانی مسلمانوں کی سامراج مخالف(Anti-Colonial) تحریک سے تعبیر کیا ہے جو کہ حکومت برطانیہ کی مسلمانوں کے انتہائی قابل احترام خلیفہ کے خلاف دشمنانہ رویئے کی وجہ سے شروع کی گئی (۱)۔ اس تحریک کی حقیقی وجوہات کو جاننے کی بڑی محدود کوشش کی گئی ہے جبکہ جذباتی انداز میں باتیں صرف ظاہری صورتحال کو دیکھ کر ہی کی جاتی رہی ہیں۔اس تحریک کا بغور مطالعہ کرنے کے نتیجے میں اس تحریک میں موجود کئی تضادات اور تکرار (Paradoxis) جو اب تک جذباتی نعروں کی وجہ سے پوشیدہ رہے ہیں وہ سامنے آتے ہیں۔اس تحریک کی سب سے بڑی ''کامیابی'' (Achievement) جو کہ اب تک چلتی آرہی ہے وہ بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ اسکے نتیجے میں مسلمان علماء(Clergy) کو سیاست میں باقائدہ کردار ادا کرنے کا موقع مل گیا اور انھوں نے جمعیت علماء ہند کی صورت میں ایک سیاسی تنظیم بنائی جس کے ذریعے علماء نے سیاسی ونظریاتی بنیادوں پر سیاست میں اہم کردار ادا کرنا شروع کیا۔اس سے قبل مسلمانان ہند کی تاریخ میں علماء کو سیاسی زندگی میں اس قدر اہم اور مرکزی کردار ادا کرنے کا موقع پہلے کبھی نہ ملا تھا۔راقم کے خیال میں اس تحریک کے نتیجے میں

ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کی سوچ اور مسلمان سیاست میں رجعت پسندی کے خیالات کو بڑھاوا دینے کا موقع ملا اور اس کے اثرات اب بھی باقی ہیں۔اس وجہ سے ضروری ہے کہ تحریک خلافت کا ایک بار دوبارہ جائزہ لیا جائے اور اس کی اہمیت وافادیت کو دوبارہ سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

خلافتیوں کے دعوے (The Khilafatist Claims)

ہندوستان کے خلافتیوں کے خلافت کے حق میں دعوے مندرجہ ذیل وجوہات کی بنیاد پر مشتمل تھے:

ا۔ عثمانیہ خلافت مسلمانوں کی ''عالمگیر خلافت'' (Universal Caliphate) تھی جس کی دنیا کے کسی بھی کونے میں آباد ہر مسلمان پر پیروی کرنا لازم تھی۔

۲۔ عیسائی دنیا اور عالم اسلام کے درمیان جنگ جاری تھی اور عیسائیوں نے خلافت عثمانیہ کے یورپی علاقوں پر قبضہ کرلیا تھا اور ہندوستان کے مسلمان پر لازم تھا کہ وہ اس کے قبضے پر ماتم (Mourn) کریں۔

۳۔ برطانیہ عثمانی خلیفہ کا سب سے بڑا دشمن تھا اور اس نے جنگ عظیم اول کے بعد خلیفہ کو استنبول میں محصور (Captive) کرلیا تھا۔اس لئے ان کا دعویٰ تھا کہ خلیفہ کو اس کی ذاتی حیثیت اور اس کے رتبے (office) سمیت تحفظ فراہم کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی خلیفہ کے رتبے کی خودمختاری کو بھی بچایا جائے اور عثمانیہ سلطنت کے تمام عرب علاقوں اور مسلمانوں کے مقامات مقدسہ پر خلیفہ کے اختیار کو برقرار رکھا جائے اور ان کے تقدس اور احترام کو بحال رکھا جائے۔

اُس وقت کے حقائق کا جائزہ یہ بات ثابت کرتا ہے کہ خلافتیوں کے یہ تمام دعوے مشکوک (Dubious) تھے۔ہم اس مختصر مقالے میں ان معاملات کا اختصاراً جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

سلطنت عثمانیہ کی ابتداء

عثمانوی سلطانوں کا خلیفہ کا رتبہ حاصل کرنا ایک متنازعہ معاملہ رہا ہے۔ موجودہ جدید دور میں جب عثمانی سلطانوں نے اپنے لئے خلیفہ کا لقب چنا تو اس کے پس پشت انکا دعوی یہ تھا کہ انھیں "خلافت" بغداد کے عباسی خاندان کے ایک فرد المتوکل نے عثمانی سلطان سلیم اول کو منتقل کی تھی۔ المتوکل اس وقت مصر میں مملوک حکمران بیبارز Baybars کے قیدی کی حیثیت میں زندگی گزار رہا تھا جسے سلیم نے ۱۵۱۷ میں شکست دی تھی۔ بیبارز جو کہ مملوک حکمرانوں میں سب سے منفرد حیثیت کا مالک تھا در حقیقت ایک ترک غلام تھا۔ بیبارز نے المتوکل کے والد کو جو کہ آخری عباسی خلیفہ کے چچا تھے انھیں بڑی شان وشوکت کے ساتھ قاہرہ (Cairo) میں مسند پر بٹھایا جسے محققوں نے بوگس خلیفہ (Pseudo Caliph) نمائشی خلیفہ کے لقب سے تعبیر کیا ہے (۲)۔ جس کے پاس بیشک نام اور لقب تو تھا لیکن بغیر کسی اختیار کے۔ اس نمائشی خلیفہ کو مسند پر بٹھانے کے پس پشت بیبارز کے اصلی مقاصد میں یہ بات شامل تھی کہ اسکے ذریعے وہ اپنے اقتدار کے لئے مسلمانوں کی نظروں میں جائز مقام حاصل کرنے کا خواہشمند تھا (۳)۔ المتوکل نے اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنے مرحوم والد کا کردار سنبھال لیا۔ اس کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ آخری عباسی خلیفہ کا قانونی وراث ہے جبکہ درحقیقت وہ ایک ایسا شخص تھا جس کے پاس نہ کوئی ملک تھا نہ ہی کوئی اختیار۔ اس کے پاس بس علامتی طور پر ایک تعلق تھا جو کہ اس کے عباسی سلطنت (Dynasty) سے تعلق اور نسبت کی علامت تھا اور یہ علامت ہی بیبارز کے لئے بہت سودمند تھی۔ قاہرہ کی فتح کے بعد عثمانی سلطان سلیم شکست خوردہ مملوک حکمران بیبارز کے جبری مہمان یعنی بے یار ومددگار المتوکل کو اپنے ساتھ استنبول لے آیا تاکہ مملوکوں کو ان کے آئندہ کے کسی بھی ممکنہ خلافت کے قانونی دعوے سے محروم کر سکے۔ تاریخ دان "خلافت" کے عمل کے المتوکل سے سلیم کے نام منتقلی کو بڑے شکوک وشبہات سے دیکھتے ہیں (۴)۔ یہ بات کہی گئی ہے کہ المتوکل اس حیثیت میں ہی نہ تھا کہ وہ خلافت کسی اور کو منتقل کرتا کیونکہ وہ نہ تو خود کسی ملک پر حکمرانی کر رہا تھا اور نہ ہی اس کے پاس کوئی قوت تھی۔ اس بات کا سب سے اہم ثبوت یہ ہے کہ سلیم اور اس کے بعد اس کے آنے والے جانشینوں نے آئندہ آنے والی تقریباً ساڑھے تین صدیوں تک اپنے آپ کو کبھی بھی خلیفہ نہیں کہلوایا۔ اس تمام عرصے

میں عثمانی خلافت کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ اس کے بجائے عثمانی سلطانوں نے "غازی" کا لقب استعمال کرنے میں فخر محسوس کیا۔

قرون وسطی کے مسلمان حکمرانوں کے لئے یہ بات عام ہو چلی تھی کہ وہ اپنے آپ کو خلیفہ کہلوائیں۔ یہ دیگر القابات جیسا ایک لقب تھا جنھیں وہ اپنی شان وشوکت بڑھانے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ ترکی میں بھی اسی قسم کی روایت (practice) نے جنم لیا اور کئی دہائیوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ خلیفہ کا لقب بھی ان دیگر کئی القابات میں سے ایک تھا جو کہ عثمانی سلطانوں نے اپنے لئے منتخب کئے۔ لیکن سرکاری اور باقائدہ طور پر خلیفہ کا لقب عثمانیوں نے ۱۷۷۴ تک استعمال نہیں کیا یعنی سلطان سلیم کی مملوکوں پر مشہور کامیابی کے ۴۰۰ سال بعد تک بھی یہ لقب استعمال نہیں ہوا۔ اس سال (یعنی ۱۷۷۴) عثمانی سلطانوں کا خلیفہ کا لقب استعمال کرنے کی ابتداء ایک اتفاقی واقعہ تھا۔ روسیوں نے اپنی فتح کے بعد جب مذاکرات اور معاہدۂ کچ کینائر (Treaty of Kucuk Kaynar) کے لئے بات چیت شروع کی تو انھوں نے اپنی ملکہ Empress کو کیتھرین اعظم (Cathereni the Great) کے لقب سے پکارا۔ جس سے اس کا (Orthodox) قدامت پسند چرچ کے سربراہ ہونے کا دعوی تھا۔ اس دعوے کا مطلب یہ تھا کہ روس کا حکمران تمام آرتھوڈکس عیسائیوں کے سربراہ ہونے کی وجہ سے عثمانی سلطنت کے عیسائیوں کی وفاداری کا حق دار بن گیا تھا۔ سلطنت عثمانیہ کی مذاکراتی ٹیم کے ایک رکن نے اپنی کم مرتبہ کی جھجک مٹانے اور عیسائی ریاست سے مقابلہ کرنے کے لئے اپنے "مالک سلطان" کو بھی تمام مسلمانوں کا حکمران ثابت کرنے کے لئے "خلیفہ" کا لقب استعمال کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ روسی سلطنت میں رہنے والے مسلمانوں کی وفاداریاں بھی مسلمان خلیفہ کے ساتھ تھیں۔ اس لقب کے اختیار کرنے کے پس پشت اس کے علاوہ کوئی اور مقصد نہ تھا۔

اس واقعہ کے بعد اور غیر رسمی (informally) طور پر خلیفہ کا لقب استعمال کرنے کے باوجود بھی عثمانیوں نے کبھی بھی اپنے باقائدہ خلیفہ ہونے اور تمام مسلمانوں کے مذہبی سربراہ ہونے کا دعوی نہ کیا۔ یہ تبدیلی بہت عرصے بعد آئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عثمانیوں نے خلافت کا دعویٰ برطانیہ کی حوصلہ افزائی کے بعد اپنانے کا فیصلہ کیا کیونکہ عثمانی حکمران برطانیہ کے بڑے قریبی اتحادی تھے اور برطانیہ ان کا سرپرست تھا۔ برطانیہ کی منصوبہ بندی یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو تمام

مسلمانان عالم کے مذہبی سربراہ یعنی خلیفہ کا اتحادی اور دوست ثابت کر کے ہندوستانی مسلمانوں میں مقبولیت اوران کی ہمدردیاں حاصل کر سکتا تھا۔ برنڈ لوئس لکھتا ہے کہ برطانیہ کی حوصلہ افزائی کے باعث پہلی مرتبہ سلطان عبدالعزیز (۱۸۶۱۔۷۶) کے عہد میں عثمانی سلطانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ عثمانی سلطنت کے ہی نہیں بلکہ تمام عالم اسلام کے خلیفہ ہیں (۵)۔

عثمانی خلفاء کی قانونی حیثیت:

(Legitimacy of Otoman Caliphs)

یہ انیسویں صدی کے آخر کی بات ہے کہ جب عثمانیہ سلطانوں نے عالمگیری خلافت (Universal Caliphate) کے دعوے دار ہونے کا فیصلہ کیا۔ اب اپنے اس دعوے کو دنیا کی نظر میں جائز ثابت کرنے کے لئے کوششیں کرنا تھیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ترکوں نے پروپیگنڈے کے لئے اردو صحافت کے استعمال کا فیصلہ کیا جس پر ترکوں کا بڑا اثر ونفوذ تھا۔ اس کے ذریعے مافوق العقل (Mythical) کہانیاں گھڑی گئیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ ۱۵۱۷ میں المتوکل نے خلافت سلطان سلیم کو منتقل کردی تھی۔ خلافت کے دعوے کو قابل قبول بنانے کے لئے ضروری تھا کہ عثمانی خلیفہ اپنی خلافت کے دعوے کو گذشتہ تاریخ سے منسلک کریں۔ انھیں اندازہ تھا کہ اگر وہ کسی بھی صورت یہ ثابت کردیں کہ خلافت انہیں خاندان عباس (House of Abbas) کے کسی امین (Custodian) (چاہے وہ جلاوطن یا قیدی ہی کیوں نہ ہوں) نے عثمانی سلطان کو منتقل کی تھی تو اس صورت میں وہ اپنے دعوے کو کافی حد تک مضبوط بنا سکتے تھے جسے کسی مزاحمت (Challenge) کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اس طرح عثمانی حکمران المتوکل کی قبر سے اپنے لئے خلیفہ ہونے کا ثبوت ڈھونڈنا چاہتے تھے۔

ہندوستان کے مسلمان عثمانی خلیفہ کے خلافت کے دعوے کو جائز تسلیم کرنے کے مسئلے پر دو گروہوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دونوں گروہوں نے تمام تر اختلافات کے باوجود خلافت کے المتوکل سے سلطان سلیم کی طرف منتقلی کی خود ساختہ کہانی کی حقیقت کے بارے میں جاننے کی کوئی کوشش نہ تھی۔ بریلوی روایات کے پیروکار مسلمانوں نے عثمانیوں کے خلافت کے المتوکل سے سلطان سلیم کی منتقلی کی فضول کہانی کی صحت پر سوال اٹھانے کے بجائے

ایک بنیادی اصول(principle) کی بنیاد پر مسترد کردیا۔اردوصحافت کےترک خلفاء کے زیراثر ہونے اور اردو صحافت میں خلافت کے بھرپور دعوؤں اور حمایت کے باوجود بریلویوں کے اعتراضات(Objections) بڑی بنیادی نوعیت کے تھے۔ان کا خیال یہ تھا کہ خلافت کا جائز وارث صرف قریش قبیلے سے تعلق رکھنے والا شخص ہی ہوسکتا تھا۔عثمانی کسی بھی طرح قریش سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔اس لئے وہ خلافت کی سب سے بنیادی اور اہم شرط پر بھی پورا نہیں اترتے تھے۔ بریلویوں کے اس دعوے کے پس پشت مظبوط دلائل اور اسلامی تاریخ کی روایات موجود تھیں۔نامور مسلمان فقاء بشمول امام غزالی اور الماوردی اس بات پر پہلے ہی زوردے چکے ہیں کہ فقط کہ قریش خاندان کا شخص ہی خلیفہ بننے کا اہل ہوسکتا تھا(٦)۔ بریلویوں کی طرف سے عثمانیوں کے دعوے کومسترد کئے جانے کے بعد مولانا عبدالباری فرنگی محل نے فروری ١٩١٩ میں مسلمانان ہند میں ترک خلافت کو جائز قرار دینے کے لئے ایک فتویٰ جاری کیا جس میں یہ بات کہی گئی کہ خلیفہ ہونے کے لئے قریش النسل(Descent) ہونا لازم نہیں۔مولانا باری کے اس فتویٰ کے مدمقابل بڑی قدآور اسلامی شخصیات امام غزالی اور الماوردی کی تعلیمات تھیں اس لئے فرنگی محل کے اس فتویٰ کو نا صرف بریلویوں بلکہ بااثر دیوبندی علماء نے بھی مسترد کردیا۔مینالٹ(Minault) نے یہ بات کہی ہے کہ اس وقت کے کئی علماء نے مولانا فرنگی محل کے اس فتوی پر دستخط کرنے سے انکار کردیئے۔ مینالٹ کے مطابق فرنگی محل کے فتویٰ سے دیوبند، پنجاب اور بنگال کے کئی نامور علماء نے اختلاف کیا(٧)۔

خلافت کے مسئلے پر بریلوی مسلمانوں کے اس اصولی موقف کو اکثر اسکالرز نے مکمل طور پر نظرانداز کردیا ہے۔ بریلویوں کا اثر نہ صرف شہروں تک محدود تھا بلکہ ان کے پیروکار بڑی بھاری تعداد میں دیہی علاقوں میں بھی آباد تھے۔ بریلوی عقائد اور دیوبندی روایات (جن کی تعلیم دیوبند دارالعلوم سے کافی پرانی ہے) کے درمیان اختلافات کافی پرانے ہیں۔ بریلوی عقائد کے مطابق خدا اور تمام انسانوں کے درمیان تعلق اور وسیلہ پاکدامن انسان یعنی پیر ہوتے ہیں اور اس کا اہم ثبوت پیغمبر اسلام کا عام انسان اور اللہ کے درمیان وسیلہ بننا ہے(٨)۔ یہ باتیں توہم پرستی کے باوجود ہندوستانی اسلام کی میانہ روی کی روایت کی علامت ہیں۔ اسکالرز اور محققوں نے جنوبی ایشیا کی اسلام کی بریلوی روایات کو مکمل طور پر نظرانداز کیا ہے۔

سینیال (Sanyal) کی بنیادی نوعیت کی تحقیق اس میدان میں بہر حال ایک منفرد اورابتدائی نوعیت کی تحقیق ہے(۹)۔

خلیفہ کے تصور کا غیر امتحانی جائزہ:

(The Unexamined Concept of Khalifa)

ابوالکلام آزاد جو کہ ہندوستانی خلافت تحریک کے تشکیل کاروں میں شامل تھے۔انھوں نے اسلام کے روایتی اور بنیادی اصولوں سے دور ہٹتے ہوئے اس تحریک کی حمایت کچھ ان الفاظ میں کی(۱۰):

> '' یہ شریعت کا قانون ہے کہ ہر دور میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ اورامام ہونا چاہئیے۔خلیفہ سے مراد ایک ایسا بااختیاراور آزاد مسلمان بادشاہ یا حکمران ہے جو کہ حکومت بھی رکھتا ہواوراسکے ساتھ ساتھ ملک کا حکمران بھی ہواور وہ مکمل اختیار کے ساتھ اپنی ریاستی حدود میں بسنے والے مسلمانوں اوران کی جغرافیائی حدود (territory) کی حفاظت بھی کر سکتا ہواور وہ شریعت کے قوانین کا اعلان کرنے اوران کو نافذ کرنے کا اختیار بھی رکھتا ہواوراتنا طاقتور ہو کہ وہ اسلام کے دشمن کا مقابلہ کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہو۔''

ہندوستان کے خلافتیوں کے خیال میں ترکی کے سلطان مسلمانوں کے جائز خلیفہ تھے اور مسلمانوں کے لئے یہ لازم تھا کہ وہ عثمانی خلیفہ سے اپنی وفاداری ثابت کریں۔

یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ ہندوستان کی خلافت تحریک پر ضخیم مواد (Voluminous Literature) میں جو کہ آزاداور دیگر کئی افراد نے فراہم کیا ہے،اس تحریک کے مذہبی پہلو ہی کو زیادہ اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ آزاد اوردیگر لوگوں کی باتوں پر تنقید کئے بناءان پر مکمل یقین کرلیا گیا ہے۔۔اس لئے خلافت تحریک کا حقیقی جائزہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس بنیادی سوال کو زیرِغور نہ لایا جائے جو کہ اس تحریک کا نکتہ آغاز تھا۔

اگر اس مسئلے پر غور شروع کیا جائے تو بنیادی تضاد اس دعوے پر اٹھتا ہے جہاں عثمانیوں نے خلافت کے المتوکل سے سلیم کی طرف منتقلی کے دعوے کو اٹھایا ہے اور جسے ہندوستانی خلافتیوں نے بغیر سوال کئے اسے عثمانیوں کے لئے جائز اختیار (Charter) کے طور پر تسلیم کرلیا ہے اور آزاد نے خلافت کی اس منتقلی کے عمل کو ہر صورت میں جائز مان لیا ہے۔ آزاد نے سلطنت عثمانیہ کے خلافت کے دعوے کی حمایت مین جن شرائط کو تسلیم کیا ہے وہ ابتداء ہی سے ناقص تھیں۔ آزاد نے بذات خود جو شرائط عائد کیں ہیں اس کے مطابق بھی المتوکل کا عباسی خلافت کا جائز امین (Custodian) ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ وہ نہ تو مسلمان بادشاہ تھا اور نہ ہی کسی ریاست کا حکمران تھا اور نہ ہی وہ ایک آزاد، خودمختار اور طاقتور شخص تھا۔ کیونکہ وہ تو مملوک حکمران بیبارز کا ایک قیدی تھا۔ اس لئے ان حالات میں اس کی طرف سے شرعی قوانین کے نفاذ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی المتوکل اس حیثیت میں تھا کہ وہ خلافت کو عثمانیوں کو منتقل کر سکے کیونکہ وہ بذات خود ہی ایک جائز خلیفہ نہ تھا۔ اس کے پاس دینے کو کوئی چیز نہ تھی۔ عثمانی خلیفہ کی طرف سے خلافت کے دعوے پر یہ تنقید بالکل الگ اور اس اعتراض سے جدا تھی جس کا اظہار بریلویوں نے کیا تھا۔ آزاد کا خلافت کی حمایت کا دعوی تضادات سے بھرپور تھا۔

لفظ خلیفہ کے معنی: (Meaning of the Word "Khalifa")

یہ بڑا ہی اہم ہے کہ ہم ابتداء ہی میں لفظ "خلیفہ" کے معنی و مفہوم سمجھ لیں اور خاص طور پر وہ طریقہ کار جس کے تحت یہ لفظ بعد ازاں لسانی طور (Linguistically transformed) پر منتقل ہوا اور خاص طور پر جب اموی بادشاہوں نے فوج کی طاقت کے بل بوتے پر اقتدار پر قابض ہونے کے بعد اپنی حکمرانی کو جائز ثابت کرنے کے لئے لفظ "خلیفہ" کو استعمال کیا۔ لفظ "خلیفہ" عربی کے لفظ "خَلَفَ" سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں "پیروی کرنا" یا "بعد میں آنا" کے ہیں۔ اس کا مطلب جانشین (Successor) بالترتیب ہے نہ کہ موروثی جائیداد یا دیگر خصوصیات کا وارث۔ جب پیغمبر محمد ﷺ کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکرؓ ان کے جانشین مقرر ہوئے تو وہ مستقل طور پر خلیفۃ الرسول اللہ یا جانشین پیغمبر رسول اللہ کہلاتے رہتے۔ اپنے حقیقی معنی میں جانشینی کے لئے استعمال کیا گیا لفظ "خلیفہ" کسی عہدے، رتبے اور حق حکمرانی یا اسی قسم کے آفس کو

ظاہر نہیں کرتا جس طرح کہ بالکل مختلف معنوں میں یہ بعدازاں استعمال ہوا۔ اس لحاظ سے لفظ "خلیفہ" بطور "جانشین" کے کسی مخصوص شخص قبل ازیں (Preceder) کے مخصوص جانشین (successor) کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اسی لئے حضرت ابوبکر صرف خلیفہ تھے اپنے قبل ازیں یعنی رسول اللہ کے۔ یعنی مخصوص پیغمبر کے مخصوص خلیفہ۔

اس تناظر میں جب حضرت عمر مسلمان امہ کے سربراہ مقرر ہوئے یعنی حضرت ابوبکر کے جانشین مقرر ہوئے تو اسی لحاظ سے انھیں خلیفہ الخلیفۃ الرسول اللہ یعنی جانشین براہ جانشین پیغمبر خدا (Successor to the Successor to the messenger of Allah) کہا جانا چاہئے تھا۔ اس لئے ہر نئے جانشین کے ساتھ لفظ "خلیفہ ال" پچھلے لقب کے ساتھ اضافی طور پر لگایا جانا چاہئے تھا۔ جو کہ بڑا ہی مضحکہ خیز اور بے عقلی (absurd) ہوتا۔ اس لیئے لفظ خلیفہ کا استعمال ان تمام افراد کے لئے جو کہ حضرت ابوبکر کے بعد آئے ان کے لئے ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لئے حضرت ابوبکر کے تمام جانشینوں بشمول حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی جو کہ تینوں امت کے منتخب سربراہان تھے انھوں نے اپنے لئے "امیر المومنین" یعنی مومنوں کے سربراہ کا لقب استعمال کیا۔

جب امیہ سلطنت دمشق میں قائم کی گئی تو اس وقت ان کی قانونی حیثیت پر بحث اور لڑائی شروع ہوگئی۔ گذشتہ روایتوں میں جہاں امت کی سربراہی چناؤ کے ذریعے منتخب کی جاتی تھی۔ امیہ سلطنت کے قیام کے بعد تخت پر "قبضہ" طاقت کے زور پر یعنی فوج کے استعمال کے ذریعے حاصل کیا جانے لگا۔ اسی وجہ سے مولانا مودودی نے اموی سلطنت کے اقتدار سنبھالنے کے عمل کو اسلام کے خلاف ردِ انقلاب (Counter Revolution Against Islam) یا انقلاب معکوس کے نام سے تعبیر کیا یعنی ایسا نظام جو کہ اسلام کے آنے سے قبل کے دور جاہلیہ کی طرف واپسی کا سفر تھا۔ اموی حکمران جو کہ طاقت کے زور پر بادشاہ بن گئے تھے انھیں اپنے اقتدار کو جائز ثابت کرنے کے لئے کسی علامت (Symbol) کی ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے لفظ خلیفہ کا "انتخاب" کیا۔ اس طرح انھوں نے اپنے نام کے ساتھ پیغمبر محمد ﷺ کے جانشین حضرت ابوبکر کے لقب کو ساتھ لگا کر اس بات کی امید لگائی کہ وہ لفظ ان کی حکمرانی کو جائز قرار دلواسکتا ہے جبکہ انھوں نے یہ قدم اٹھا کر اس لفظ کے معنی ہی تبدیل کر دیئے تھے۔ اب لفظ خلیفہ

صرف مخصوص پیش رو کے جانشین کے طور پر استعمال نہیں ہو رہا تھا بلکہ اب اس کا استعمال ہر حکمران یا بادشاہ کے لئے ہونے لگا۔

ایک نیا لفظ تلاش کر لیا گیا تھا۔ حالانکہ یہ لفظ اب بھی اپنی ادائیگی (Pronounciation) اور حروف تہجی (Spelling) بالکل اپنے اصل لفظ ''خلیفہ'' کی طرح استعمال ہو رہا تھا جس کے معنی ''جانشین'' کے ہی تھے لیکن اب اس کا مفہوم تبدیل ہو گیا جس کا اصل لفظ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نئے معنوں میں اس لفظ کے استعمال کا ایک نیا تصور (Neo-Logism) سامنے آیا تھا جس کا اصل لفظ ''خلیفہ'' (یعنی جانشین) سے کوئی لسانی تعلق (Etymologically) یا (Semantically) نہ تھا۔ اس نئے لفظ کا مطلب بادشاہ یا مطلق العنان حکمران تھا۔ سرسید احمد خان نے اس پر اپنا تبصرہ دیتے ہوئے لکھا:

> ''لفظ خلیفہ کو حضرت عمر نے اس وقت چھوڑ دیا تھا جب وہ حضرت ابوبکرؓ کے جانشین مقرر ہوئے تھے۔ اس کے بدلے انھوں نے امیر المومنین کے لقب کو استعمال کرنا شروع کیا۔ یہ لقب حضرت علی بلکہ ان کے بعد بھی کچھ عرصے تک استعمال ہوتا رہا...... اس کے بعد اور پھر حضرت امام حسین کے بعد امیہ خاندان کے افراد جنھوں نے طاقت کے بل بوتے پر اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا؟ انھوں نے اپنے آپ کو خلیفہ کہلانا شروع کر دیا(۱۴) کیونکہ ان کا خیال تھا کہ خلیفہ کا لقب امیر المومنین کے بالمقابل زیادہ ''مقدس'' تھا(۱۵)۔

لفظ خلیفہ جسے اموی بادشاہوں نے بڑے طریقے سے اپنے مطلق العنان حکمرانی کو جائز قرار دینے کے لئے استعمال کیا یہ لفظ ان کے لئے بے معنی رہتا اور ان کو مطلوبہ قوت فراہم نہ کرتا اگر اس لفظ کو پیغمبر اسلام کے چار جانشینوں سے منسلک نہ کیا جاتا۔ لیکن عمومی تاثر یہی رہتا تھا کہ اموی حکمران اس درجے پر فائز نہ تھے جہاں کہ ابتدائی چار خلفاء تھے اس لئے حضرت ابوبکرؓ اور ان کے تین جانشینوں کے القابات کو تبدیل کر کے انہیں "خلفاء راشدین" (۱۶) (Highly Guided Caliphs) بنا دیا گیا۔ اس سے یہ بات واضح تھی کہ اگر مذہبی طور پر ابتدائی چار خلفاء کو کوئی مخصوص مذہبی مقام حاصل تھا تو اس کا امیہ دور میں آنے والے باقی نہ ...

مکمل طور پر اطلاق نہیں ہوتا تھا۔

امیہ دور تک لفظ "خلیفہ" کا کسی مخصوص مذہبی معنوں میں استعمال شروع نہ ہوا تھا۔ ان کے لئے یہ لفظ اب تک صرف اپنے اختصار کو قانونی شکل دینے کی ایک صورت تھی بلکہ اسی طرح جس طرح کہ قرون وسطی کے یورپ میں بادشاہ اپنے اقتدار کے لئے "الہامی حقوق" (Divine rights of the Kings) کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ کچھ صدیوں بعد ممکن ہوا کہ جب لقب "خلیفہ" کی مذہبی اہمیت کو سمجھا گیا اور پھر اس کی بنیاد پر عباسی خلافت کے آخری دنوں میں جبکہ خلافت تنزل اور زوال کا شکار تھی اور جب خلیفہ عسکری کمانڈروں یا علاقائی شہزادوں کے آگے کٹھ پتلی بن کر رہ گئے تھے۔ اس وقت اقتدار پر ان حقیقی قابض لوگوں نے ایک ایسے نظریہ کی تخلیق کرنے کا سوچا جس کے تحت خلیفہ کو بحیثیت سیکولر حکمران کے ریاستی قوت کے مرکز سے علیحدہ کر کے اسے محض نمائشی سربراہ بنا کر رکھا جاسکے جس کہ فرائض اب مذہب کے دائرہ اختیار تک محدود تھے اور اب اس کا ریاست کے امور میں کوئی خاص مقام اور کردار نہ تھا۔

خلیفہءخدا:(God's Caliph)

سنی روایات کے مطابق مذہبی معاملات "امام" کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں لیکن پوپ کے مقابلے میں امام کے پاس کوئی مذہبی "اختیار" نہیں۔ جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسلام کسی مذہبی پیشوائی یا پوپ کے تصور کو تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انفرادی شعور کا حصہ ہے۔ امام درحقیقت وہ رہنما ہیں جو کہ اپنی ذاتی اور مذہبی کاملیت (Perfection) اور علم میں کمال فن (Excellance) کے باعث امام تسلیم کئے جاتے ہیں امام کی کوئی تعیناتی نہیں کرتا۔ گذشتہ روایات کے برخلاف عباسی دور کے آخری ایام میں خلیفہ کے ساتھ برائے نام (nominal) مذہبی اہمیت کو منسلک کر دیا گیا۔ اس صورتحال نے مزید اس وقت نمو پائی جب خلیفہ اور امام کے تصور میں تصادم (Conflating) پیدا ہوا۔ یہ اسی عہد کی وہ بگڑی ہوئی روایات تھیں جن کو (مولانا) آزاد نے اوپر بیان کئے گئے الفاظ میں رقم کیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی "خلیفہ" کے ساتھ منسلک مذہبی اعزازات (Attribute) میں بھی اضافہ ہوگیا۔ اس عہد میں خلیفہ کو "خلیفہ اللہ" یعنی "خلیفہ خدا" یا جانشین کے طور پر پکارا جانے لگا۔

(مولانا) آزاد نے دراصل اسی خلیفۃ اللہ کا تصور ہی ذہن میں رکھ کر ہی خلیفہ کے معنی اور مفہوم کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ جن معنوں میں آزاد نے عام طور پر خلیفہ اللہ کے تصور کو استعمال کیا ہے اسے کلاسیکل اسلامی فقہاء نے مکمل طور پر مسترد کر دیا ہے اور یقیناً آزاد جیسا شخص ان تاریخی حقائق سے لاعلم نہ تھا۔ الماوردی خلافت اللہ کی شدید مخالفت کرتے ہوئے اپنے کلاسیکل کام "الاحکام السلطانیہ" میں اس بات سے بالکل متفق نہیں کہ خلیفہ کو خلیفۃ اللہ کہا جائے۔ علماء کا اس بات سے اتفاق ہے کہ اس لفظ کا استعمال نہیں کیا جا سکتا بلکہ ایک نے تو کہا کہ اس کا استعمال فجیر یعنی قابل گناہ ہے کیونکہ خلیفہ یعنی جانشین صرف اس شخص کا ہوتا ہے جو کہ یا تو غائب ہو جائے یا انتقال کر جائے۔ اللہ نہ تو غائب ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ مر سکتا ہے" (۱۷)۔

اگنے گولزر (Ignaz Goldziher) لکھتے ہیں کہ جب اموی حکمرانوں نے خلیفہ اللہ کا نمائشی (pretentions) لقب استعمال کرنا شروع کیا تو اس کے پس پشت مقصد یہ تھا کہ یہ بات بتائی جائے کہ حکمران لامحدود اختیارات کا حامل ہے۔ بعد میں آنے والے عباسی حکمرانوں کے دور میں اس لقب کو مزید مذہبی (Theocratic) مواد سے بھر دیا گیا۔ عثمانی سلطانوں کے متعلق یہ تصور کر لیا گیا کہ وہ بھی گزشتہ خلفاء کی طرح ان القابات کے اہل ہیں جو کہ صرف پرانے خلفاء کے لئے مختص تھے۔ جیسا کہ خلیفہ اللہ کا لقب بھی انھیں گزشتہ خلفاء سے منتقل کیا گیا (۱۸)۔ آزاد اپنے تصور خلیفۃ اللہ کی اساس عباسی عہد میں بگاڑی گئی روایات پر رکھتے ہیں۔ اس طرح آزاد اسلام کی سب سے پسماندہ (backward) اور رجعت پسندی کی روایات کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔

سرسید احمد خان کا خیال اس مسئلے پر بالکل واضح طور پر مختلف تھا۔ وہ خلافت جو کہ ایک سیکولر کام تھا اور امامت جو کہ مذہبی مسئلہ تھا، اس کے بارے میں بڑے واضح موقف رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے یہ بات کہی کہ پیغمبر اسلام کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکر خلیفۃ الرسول مقرر ہوئے تھے لیکن ان کے پاس کوئی دینی اختیار نہیں تھا۔ انھوں نے متواتر یہ بات لکھی کہ خلیفہ روم کے کیتھولک پوپ کی طرح نہ تھے۔ سرسید نے اس بات کی نشاندہی کی کہ حضرت ابوبکر مسلمان معاشرے کے صرف انتظامی سربراہ تھے (۲۰)۔

ایک ہمعصر محقق ایم اے شعبان بھی بالکل یہی بات کہتے ہیں۔ انھوں نے لکھا کہ

کوئی بھی شخص محمد ﷺ کا حقیقی جانشین ہونے کا دعویدار ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ کوئی بھی شخص ان کے برابر کی الہامی منظوری (sanction) نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس لئے حضرت ابوبکرؓ کے پاس کوئی مذہبی اختیار نہ تھا۔ اس لئے ان کو کسی بھی طرح سے پوپ اور پاک رومی بادشاہ (Holy Roman Empire) کا عظیم ملاپ نہیں کہا جا سکتا" (۲۱)۔

آخری عباسی عہد میں جبکہ خلیفہ کے پاس کچھ نہ بچا تھا سوائے دارالخلافہ کے اور وہاں بھی اس کا اختیار بڑا ہی محدود تھا، اس وقت مذہبی اعزازات (Attributes) میں بڑی تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ خلیفہ کے ریاست پر کنٹرول کم ہونے کی وجہ سے وہ صرف ایک مذہبی رہنما کے طور پر باقی تھا نہ کہ ایک سیکولر نمائندے کے۔ اب خلیفہ متعدد جگہوں پر امام کے طور پر پیش کیا جارہا تھا۔ اگنے گولزر Ignaz Goldziher لکھتے ہیں کہ:

> آخری عباسی عہد میں خلیفہ کا لقب مکمل طور پر مذہبی معنوں (Theocratc Contacts) میں استعمال ہونا شروع ہوگیا اور یہ دعوے شروع ہوئے کہ خلیفہ اس ارض پر خدا کا نمائندہ ہے اور یہاں تک بات ہوئی کہ وہ زمین پر خدا کا سایہ ہے"۔

اس وقت کے نظریہ سازوں نے سوچا کہ خلیفہ زمین پر خدا کا سایہ ہے۔ وہ تمام لوگ جو مسائل میں گھرے ہوئے ہیں وہ اس میں (یعنی ذلوالٰہی فی ارض یا ارضی کل معلیفون) پناہ تلاش کر سکتے ہیں۔ ان ہمعصر تحفوں نے نمائشی مذہبی القابات (Pompus theocratic Titles) لگا کر خلیفہ کو بیشک بڑے مذہبی کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی لیکن دراصل اس کے پس پشت بادشاہوں کی دنیاوی معاملات میں اختیارات سے محرومی کو چھپانے کی خواہش کے طور پر دیکھا ہے۔ عام طور پر یہ تصور تھا کہ چونکہ عثمانی سلطان اس وقت بیشتر اسلامی علاقوں پر حکمرانی کر رہے تھے۔ اس لئے انھیں خصوصی طور پر یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ پرانے خلفاء کے القابات مثلاً خلیفۃ اللہ کا بھی استعمال کر سکتے ہیں (۲۳)۔ عثمانی سلطنت کی پروپیگنڈا مشینری نے عثمانی خلفاء کے مذہبی کردار کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تا کہ دنیا کے دیگر مسلمانوں کی طرح ہندوستانی مسلمانوں کی وفاداریاں بھی سلطانی خلیفہ کے ساتھ منسلک کی جاسکیں۔ انڈیا میں اسلام کے خودساختہ محافظوں نے اس تبدیلی کو بڑی کشادہ دلی سے قبول کیا۔ کیونکہ اس طرح

ہندوستانی معاشرے میں ان کا اپنا مقام بھی مزید بلند ہوسکتا تھا اور وہ ہندوستانی سیاست اور ہندوستان کی مسلمان معاشرے میں خلیفہ اور ''اس کے لوگوں'' کے درمیان رابطہ کار (Mediator) کا کردار ادا کر سکتے تھے۔

تھوڑے ہی عرصے بعد مسلمان مفکرین اور اسکالرز ''اختیاری'' (Authoritative) مضامین، اختراعی خیالات اور دیگر مواد کے ساتھ سامنے آنا شروع ہو گئے۔ جس میں خلیفہ کے ''مذہبی'' کردار کو بڑھا چڑھا کر بطور ''امام'' تسلیم کئے جانے پر زور دیا جا رہا تھا۔ وہ دن گزر گئے تھے جب ریاست کے سیکولر سربراہ کے طور پر خلیفہ کا باقاعدہ انتخاب عمل میں لایا جاتا تھا۔ جس کی مثال خلفاء راشدین یعنی ابتدائی چار خلفاء کا انتخاب تھا۔ خلیفہ کا یہ بدلا ہوا مذہبی پہلو اسلام کے ابتدائی دنوں کے اس تصور کے بھی بالکل متصادم تھا جہاں خلیفہ ریاست کا ایک سیکولر حکمران تھا اور امام بطور ایک مذہبی پیشوا کے اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔ امیہ دور حکومت میں بھی جب کہ اموی حکمرانوں نے اپنے لئے لفظ "خلیفہ" کا استعمال شروع کر دیا تھا اس کے باوجود یہ دفتر (office) سیکولر ہی رہا۔ یہ بہت بعد تنزلی کے دور میں ہوا کہ یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے اندر اس طرح گڈمڈ ہو کر رہ گئے کہ ان میں فرق کرنا مشکل ہو گیا اور جس طرح ہم نے اوپر (مولانا) آزاد کے بیان کئے گئے خیالات میں دیکھا، یہ دونوں الفاظ یعنی خلیفہ اور امام ایک ہی سانس میں بولے جانے والے ہم معنی لفظ ہو گئے۔ اس لئے آزاد نے عثمانی سلاطین کے ادوار کی طرف اشارہ کرتے وقت دونوں الفاظ کے فرق میں کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ مولانا آزاد کے اوپر بیان کیا گیا خیال بھی درحقیقت ان بگڑے ہوئے ادوار کی ہی اپنی غلطیوں کی نشاندہی کرتا ہے جب ان الفاظ کے معنی و مطلب میں کوئی فرق نہ رہا۔

عالمگیری خلافت: (The Universal Caliphate)

مولانا آزاد کی تقریروں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر دور میں صرف ایک خلیفہ ہی رہ سکتا ہے۔ اگر آزاد کی اس بات کو تسلیم کرنا ہو تو پھر ہمیں مسلم تاریخ کے بہت سے واقعات سے آنکھیں بند کرنا پڑیں گی۔ اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں ایک ہی وقت میں کئی حریف خلفاء مسلم دنیا کے مختلف علاقوں پر حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ کئی خلیفہ ایک ساتھ ایک ہی وقت میں بھی

حکمران رہے۔اس کی سب سے اہم مثال تو ہم اس بات سے دے سکتے ہیں کہ جس وقت بغداد میں عباسی خلیفہ حکمران تھے اسی وقت اسپین میں امیہ خلیفہ حکمرانی کر رہے تھے جبکہ مصر میں فاطمی خلفاء کی حکمرانی تھی۔ان تین حریف خلفاء کے علاوہ اس وقت کئی دیگر خودمختار مسلمان بادشاہتیں اپنا وجود رکھتی تھیں جن کے حکمران بھی خلیفہ ہونے کے دعوے دار تھے۔

C.E. Boswarth نے اس پر بڑا جامع تحقیقی کام کیا ہے اور اس کا خیال ہے کہ اس وقت کم از کم بیاسی (۸۲) مختلف اسلامی خلفاء مختلف علاقوں میں حکمرانی کر رہے تھے (۲۴)۔اسلام کی طویل تاریخ میں دیکھا جائے تو یہ عثمانی سلطان تھے کہ جنہوں نے تمام اسلامی دنیا کے لئے ایک واحد "عالمگیر خلیفہ" کے تصور کو اسلامی سیاست کا ایک بنیادی جز بنا دیا، اور یہی وہ بنیاد تھی جس کے ذریعے وہ اپنے اس دعوے کی حمایت میں ہندوستانی مسلمانوں سے وفاداری کے خواہش مند تھے۔عالمگیری خلافت کا یہ تصور خام خیالی (Fiction) پر مبنی تھا اور یہی وہ خوش فہمی تھی جس پر خلافت تحریک کی عمارت کھڑی کی گئی تھی۔

آزاد نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ اسلامی شریعت ہے کہ ہر دور میں مسلمانوں کے لئے ایک "خلیفہ" اور "امام" ہونا ضروری ہے یعنی عالمگیر خلیفہ۔لیکن اپنا دعویٰ کرتے ہوئے اس نے کسی ماخذ کا ذکر نہیں کیا جہاں پر یہ شرعی قانون بتایا گیا ہو آزاد نے بہت بڑے بڑے دعوے دریا دلی اور بغیر کسی ماخذ اور اسلامی تاریخ کے ٹھوس ثبوت پیش کئے بناء بیان کر دیئے ہیں۔آزاد کے مخاطبین جس میں زیادہ تر نیم تعلیم یافتہ اور نیم جاہل (ill-informed) لوگ تھے وہ تو آزاد کی تقاریر میں تو ان کے عربی زبان میں کئے گئے حوالوں (quotation) سے ہی متاثر ہو جاتے تھے جن کا کہ وہ اپنی تقریروں کے دوران بھرپور استعمال کرتے تھے۔دیکھا جائے تو لگتا ایسا ہے کہ درحقیقت آزاد کی پہلی زبان عربی ہی تھی۔ان لوگوں کے پاس آزاد کے کئے گئے دعوؤں کی حقیقت جاننے کے لئے کوئی اور طریقہ کار نہیں تھا۔ان حاضرین کے لئے آزاد اور دیگر لوگوں کے خیالات مکمل طور پر قابل قبول تھے کیونکہ وہ ان کی صداقت کو تو پہلے ہی سے تسلیم کر چکے تھے۔اس کے پہلے کے اسکالرز جنھوں نے اس کو مذہبی رنگ (pontiticated) میں پیش کیا ان کے خیال میں وہ صرف نعرے باز لیڈر (cheer-leaders) تھے۔

سر سید احمد خان نے خلافت کے عالمگیری تصور کے خلاف بھرپور انداز میں دلائل دیئے

نہیں۔ان کا خیال تھا کہ ہر خلیفہ کا اختیار اس مخصوص علاقے تک محدود تھا جو کہ براہ راست اس کے زیر حکمرانی تھا۔خلافتیوں نے سرسید احمد خان کی اس دلیل کو مسترد کرتے ہوئے انھیں انگریز کا غلام کہنا شروع کر دیا جو کہ اپنے آقاؤں کی بولی بول رہا تھا۔ان کا خیال تھا یہ سب کچھ ان سے برطانوی حکمران کہلوا رہے ہیں جو کہ کسی طرح سچ نہ تھا۔اگر دیکھا جائے تو یہ مولانا آزاد تھے نہ کہ سرسید احمد خان جو کہ اس وقت اس مسئلے پر عثمانی خلیفہ کے لئے حکومت برطانیہ کی ہمدردانہ پالیسیوں کے عین مطابق کام کر رہے تھے یہ آزاد تھے جو کہ خلافت کے عالمگیری تصور کی حمایت کرتے ہوئے درحقیقت برطانوی پالیسیوں کی تائید کر رہے تھے۔ان لوگوں کے سرسید احمد خان پر برطانیہ کے ہمدرد ہونے کے الزامات کو ایک طرف رکھتے ہوئے یہ بات اہم ہے کہ سرسید کا خلافت کے سوال پر موقف اصولوں پر مبنی تھا اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان کے یہ خیالات برطانیہ کی خواہشات کے بالکل برعکس تھے۔یہ ایک کلی طور پر دوسرا پہلو ہے کہ سرسید پر انگریزوں کے کٹھ پتلی (puppet) ہونے کی۔مختلف اوقات میں چاہے درست یا غلط وجوہات کی بناء پر وہ برطانوی ہمدرد (Pro-British) رہ چکے ہوں لیکن اس کے باوجود انہیں کسی بھی صورت کٹھ پتلی کہنا درست نہیں۔جس طرح اس مثال سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سرسید احمد خان کا ''عالمی خلافت'' کے تصور سے انحراف درحقیقت برطانیہ اور ترکی کے پروپیگنڈے کو چیلنج کرنے کے مترادف تھا۔

عثمانی خلفاء سے برطانوی تعلقات:

(British Relations with Ottoman Caliphs)

خلافت تحریک کے اس پروپیگنڈے کے برخلاف کہ برطانیہ سلطنت عثمانیہ کا دشمن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برطانوی حکمران گذشتہ کئی صدیوں سے سلطنت عثمانیہ کے سب سے بڑے اتحادی اور حمایتی تھے۔برطانیہ کا عثمانی سلطنت سے یہ اتحاد بغیر کسی وجوہات اور مفادات کے نہ تھا بلکہ اس کے پس پشت روس کے بڑھتے ہوئے توسیع پسندانہ عزائم تھے۔عثمانی حکمران بھی روس کے بڑھتے ہوئے خطرات سے شدید پریشان تھے اور اپنی بڑھتی ہوئی کمزوریوں کے باعث وہ مزید پریشان ہوتے چلے جا رہے تھے۔اس وقت انھیں ایک مضبوط اور طاقتور اتحادی کی ضرورت

تھی جو کہ انھیں برطانیہ کی صورت میں مل گیا تھا۔ سلطانی حکمرانوں کا پہلی جنگ عظیم میں وقتی طور پر جرمنی کے ساتھ اتحاد ان کی برطانیہ سے طویل اتحادی تاریخ اور تعلقات میں ایک مختصر وقتی وقفہ تھا یقیناً اس تبدیلی کے پس پشت کئی مجبوریاں حائل تھیں۔ ترکی کا جرمنی سے یہ انحرافی اور چونکا دینے والا جنگی اتحاد درحقیقت ترکی ان اندرونی حالات کا نتیجہ تھا جس کا کہ عثمانی حکمرانوں کو سامنا تھا۔ برطانیہ کی حتی الامکان کوشش تھی کہ ترکی اس جنگ میں اپنے آپ کو نہ الجھائے لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود ترکی نے اس جنگ میں اپنے روایتی اتحادی کے خلاف بناء کسی سوچ بچار کے حادثاتی طور پر اپنے آپ کو الجھا دیا۔ ہم اس دلچسپ صورتحال کے متعلق مزید لکھیں گے۔

برطانیہ کے عثمانی سلطنت کے ساتھ تعلقات اس کے اپنے استعماری مفادات کو مدِنظر رکھ کر بنائے گئے تھے۔ ان مفادات کے پس پشت سلطنت کے جغرافیائی محل وقوع اور خاص طور پر برطانوی سلطنت کو روسی زار کی طرف سے لاحق خطرات تھے۔ برطانیہ کے لئے عثمانی سلطنت وہ قیمتی دفاعی دیوار (Valuable Bulwark) تھی جو کہ روس کی راہ میں حائل تھی۔ سولھویں صدی سے بحری تجارتی راستوں کے کھلنے کے بعد سے صورتحال میں بڑی تبدیلی ہو چکی تھی اور بین الاقوامی Strategic ترجیحات بڑی حد تک تبدیل ہو چکی تھیں۔ اس نئی تبدیلی شدہ صورتحال میں وسیع و عریض زمینوں پر قبضے کی بجائے سمندروں پر قبضہ زیادہ سود مند سمجھا گیا۔ تمام بڑی استعماری طاقتیں سمندری حدود پر قابض ہونے کی خواہش مند تھیں بہت جلد برطانیہ ایک بہت بڑی بحری قوت بن کر ابھرا اور اس نے اپنا اثر ورسوخ دنیا کے کئی علاقوں تک پھیلا لیا۔

دنیا کی طاقت کے اس نئے عالمی کھیل میں زار روس کے لئے کئی مجبوریاں اور رکاوٹیں تھیں۔ اس کی سمندری قوت جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے کئی مشکلات کا شکار تھی۔ اس کا Baltic Fleet اس تنگ سمندری گزرگاہوں میں جو کہ سویڈن کو جرمنی اور ڈنمارک سے الگ کرتی تھی وہاں کئی مشکلات کا شکار تھا۔ اس کا Black Sea میں موجود بحری بیڑا Bosphorim اور Dardanelles کے مقامات پر بھی شدید خطرات سے لاحق ہو سکتا تھا۔ اس کا مشرقی بیڑا جو کہ Vladivostock کے مقام پر تھا وہ بہت دور اور عام گزرگاہوں سے الگ تھلگ تھا اور کسی بھی کھیل کی صورت میں کوئی مؤثر کردار ادا کرنے کے قابل نہ تھا۔ روس کو عالمی قوت بننے کے لئے سمندروں تک مزید آزاد پہنچ رکھنا ضروری تھی۔ اس صورتحال میں روس کے

پاس بہترین راستہ یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو جنوب کی طرف توسیع دے جو کہ اسے خلیج فارس اور بحیرہ عرب کے سمندروں میں مئوثر (Dominating) حیثیت دے سکتی تھی۔ لیکن روس کی یہ پیش قدمی برطانیہ کے استعماری مفادات کے لئے براہ راست خطرے کی گھنٹی بن سکتی تھی۔

عثمانی سلطنت روس کے جنوب میں سفر اور گرم پانیوں تک پہنچنے کی خواہش میں سب سے اہم منزل تھی۔ روس کے بحیرۂ عرب میں پہنچنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ عثمانی طاقت کو نیست و نابود کر دے اس لئے روس کی پالیسیاں ہمیشہ سے عثمانی سلطانوں کے ساتھ دشمنی پر مشتمل تھیں۔ روس کے جنوب کی طرف بڑھنے کی خواہش کے خوف سے سلطنت عثمانیہ اور برطانیہ کے خدشات اور مفادات یکجا ہو گئے جس نے ان دونوں کے درمیان پہلے سے قائم اتحاد کو مزید مضبوط کر دیا اور یہ اتحاد مزید کئی صدیوں تک چلا۔ انھوں نے کئی جنگیں بحیثیت اتحادی ساتھ لڑیں جن میں سب سے مشہور، طویل اور مہنگی جنگ (دولت اور انسانی خون کے حساب سے) کرائمن جنگ (Crimean War) تھی جو کہ 1854-56 کے درمیان لڑی گئی۔ اس جنگ کا اختتام برطانیہ کی عین خواہشات کے مطابق اس معاہدے پر ہوا جس کے تحت Bosphorous اور Dardnelle کے علاقوں میں کسی بھی قسم کی جنگی بحری حرکات وسکنات پر پابندی لگادی گئی جس کا براہ راست مطلب اس علاقے میں روس اور اس کے بحری بیڑے کے اثر ورسوخ کو کم کرنا تھا۔ اس معاہدے کے نتیجے میں روس کا جنوبی سمندری بحری بیڑہ بحرالکاہل (Black Sea) میں پھنس کر رہ گیا۔

سلطنت عثمانیہ کی توسیع پسندی اور تنزلی:

(Ottoman Expansionism and Decline)

عثمانی سلطنت اپنی طاقت کے عروج پر سترھویں صدی میں اس وقت پہنچی جب عثمانی سلطان کی فوجوں نے ویانہ کا دوسری بار محاصرہ کیا۔ اس لمحے کے بعد یورپ میں عثمانی طاقت کا آہستگی سے زوال شروع ہو گیا۔ ترکی کو جلد ہی ڈنوبے (Danu be) اور دریائے سوا (Sawa River) (سابقیہ یوگوسلادیہ) کے درمیان اپنے مقبوضہ یورپی علاقوں کو ہسبرگ (Habsburg) اور روس کے ساتھ اٹھارویں صدی میں لڑی جانے والی جنگوں کے نتیجے میں چھوڑنے پڑے۔ لیکن

عثمانوی سلطنت کا اختتامی زوال اس تضاد کا نتیجہ تھا جو کہ ترکی اور دو عظیم طاقتوں کے درمیان لڑائی کی صورت میں نکلا۔ یہاں ترکی کی شکست کی ذمہ دار جنوب کے سلف (slavs) لوگوں کی قومی تحریک تھی جو اپنی قومی آزادی کی جنگ میں دونوں استعماری سلطنتوں یعنی عثمانیہ اور ہسبرگ آسٹرو ہنگری شہنشاہوں (Habsburg Austro- Hungarian) سے لڑے۔ جبکہ دوسری طرف ہندوستان میں اردو پریس نے اس جنگ کو اسلام کے خلاف عیسائیت کی جنگ بنا کر پیش کرنا شروع کر دیا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگ قوم پرستی کی جنگ تھی جو کہ نوآبادیات (Colonialism) کے خلاف لڑی جارہی تھی۔

یہ کشمکش طاقت اور زمین کے حصول کے لئے تھی۔ مذہب کا اس معاملے میں کوئی دخل نہ تھا۔ "مسلمان" عثمانیوں نے اپنے "مسلمان بھائیوں مثلاً عربوں کو اپنے زیر اثر لانے اور وہاں اپنا نوآبادیاتی اقتدار قائم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ انھوں نے کئی متواتر لیکن ناکام کوششیں اپنے دوسرے مسلمان "بھائی" یعنی ایران کے صفوی حکمرانوں کو فتح کرنے کے لئے کیں۔ عثمانی توسیع پسندی کی کوششوں کا مذہب سے کوئی لینا دینا نہ تھا۔ یہ تو صرف علاقے اور طاقت کے حصول کے لئے تھیں۔ اسی طرح سلطنت عثمانیہ کے کئی علاقوں کی مسلمان عوام بھی ترکی سے اپنی آزادی کے لئے بے چین تھی۔ M.D. Stojanovic لکھتے ہیں کہ مرکزی طاقت کی کمزوری نے سلطنت عثمانیہ کے کئی صوبائی پاشاؤں میں خودمختاری کے حصول کی پہلے سے موجود خواہش کو مزید تقویت دی۔ سلطنت عثمانیہ کو اس عرصے میں کئی "مسلمان بغاوتوں" کا سامنا کرنا پڑا جن میں ایک مشہور بغاوت مصر کے محمد علی کی تھی (۳۵)۔ بجا طور پر اس بغاوت کو قومی تحریک کے بجائے ایک فوجی مہم جوئی کہا جاسکتا تھا۔ جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے کہ بالکان کے علاقے میں شروع ہونیوالی آزادی کی تحریکیں "اسلام" کے خلاف "عیسائیوں" کی جنگیں تھیں تو اس میں کوئی سچ نہ تھا۔ کیونکہ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ ہسبرگ (Habsburg) تخت کے "عیسائی" جانشین آرچ ڈیوک فرینکس فرینڈ نگ (Archduke Francis Ferdinand) کا ایک دوسرے سربیائی نسل کے "عیسائی" ایک اور سربیائی قوم پرست عیسائی کے ہاتھوں سروجیا (Sarajevo) کے مقام پر قتل تھا جو کہ پہلی جنگ عظیم کے آغاز کا موجب بنا۔ یہ بڑی مضحکہ خیز بات ہے کہ انڈیا کے مسلمان اور کٹر علماء بالکان کی اس بڑی پیچیدہ صورتحال کو بڑا ہی سادہ سمجھتے ہوئے اسے صرف

اسلام کے خلاف ایک عیسائی حملہ تصور کر رہے تھے۔ جبکہ اصل بات یہ ہے کہ اس تصادم کے پس پشت قومی سوال کو بڑی اہمیت تھی۔ انیسویں صدی پوری دنیا میں درحقیقت قوم پرستانہ جذبات کے بڑھاوے کی صدی تھی اور یہی صورتحال انڈیا میں بھی تھی۔ بالکان کی قومی تحریکیں بھی اسی عالمی صورتحال سے متاثر تھیں اور اصل صورتحال یہ تھی کہ محکوم عوام نے حکومتوں کے خلاف اپنی آزادی کی جدوجہد کو تیز کر دیا تھا۔

یونان کی آزادی

ہندوستان کے خلافتیوں کا یہ وہم تھا کہ برطانیہ یونان کا حمایتی اور ترکی کا مخالف تھا۔ یہ الزام وقتی طور پر جنگ کے دنوں کے برطانیہ کے عارضی وزیراعظم لارڈ جارج (Lloyd George) پر تو لگایا جا سکتا ہے جو کہ اس مرحلے پر ایک مخلوط حکومت چلا رہے تھے جس نے جنگ میں شکست کے بعد ترکی پر ذلت آمیز شرائط پر مبنی ایک معاہدہ تھوپا لیکن ساتھ میں یہ بات بھی واضح ہونی چاہئے کہ اس کے اس اقدام کی اس کی کابینہ کے قدامت پسند (conservative) بونر لاء (Bonar Law) نے بھی اراکین کابینہ بشمول پسند کی نگاہ سے نہ دیکھا اور یہی وجہ تھی کہ اس معاہدے کی نہ ہی توسیع نہ کی گئی اور نا ہی اس پر عمل درآمد ہوا۔ اسی وجہ سے جنگ کے اختتام پر لاوڈ جارج کی مخلوط حکومت کے اقتدار سے محروم ہونے کے بعد آنے والی تنگ نظر حکومت (Conservative Government) نے بونر لاء کے زیر قیادت ایک بار پھر ترکی اور عثمانیہ سلطنت کی حمایت کرنے کی برطانیہ کی گذشتہ روایت کو دوبارہ بحال کر دیا۔ اس لئے اس فرق کو سمجھنا نہایت ضروری ہے جو کہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

جہاں تک مشرقی Mediterranian میں برطانیہ کی طویل المدت منصوبہ بندی کا تعلق ہے تو اس صورتحال میں برطانیہ کبھی بھی یونان کا حمایتی نہیں رہا اور اس علاقے میں برطانیہ کی اس پالیسی کے پس پشت بھی زار روس کا خطرہ ہی لاحق تھا۔ جہاں تک یونان کی ترکی سے آزادی کی تحریک کا سوال ہے تو برطانیہ کی عوام میں اس تحریک کے لئے مضبوط حمایت اور ہمدردی کے باوجود برطانوی حکومت اس آزادی کی حامی نہ تھی کیونکہ برطانیہ کو خوف تھا کہ آزادی کے بعد یونان ترکی کی دشمنی میں روس کا حمایتی بن سکتا تھا اور اس کے نتیجے میں روس کو مشرقی Mediterrariean

کے علاقے میں پاؤں جمانے کا موقع مل جاتا۔ بحر حال برطانیہ میں شدید عوامی ردِعمل اور ۱۸۲۶ میں لارڈ بیرن (Lord Byron) کی موت کے بعد جو کہ یونان کی آزادی کے لئے آواز اٹھاتا رہا اور یونانی کی آزادی کے لئے لڑتے ہوئے ہی مسلونگی (Missolonghi) میں انتقال کر گیا۔ اس کے بعد برطانوی حکومت نے مجبور ہو کر نیم دلی سے یونان کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس کا اختتام ۱۹۲۹ کے معاہدہ ایڈریپول پر ہوا۔ برطانوی حکومت اس معاہدے سے اسی طرح ناخوش تھی جس طرح کہ ترکی جیسا کہ W.M. Gewehr لکھتے ہیں کہ "بالکان میں روسی خوف کی وجہ سے برطانیہ کسی بھی طرح یونان کی حمایت کرنے کو تیار نہ تھا۔ تاوقتیکہ ۱۸۳۲ میں آخری معاہدہ دستخط ہوا جس کے نتیجے میں بالآخر ایک آزاد یونانی ریاست کے قیام کی شکل سامنے آئی۔ پھر بھی نئی وجود میں آنے والی یونانی ریاست اس کٹی پھٹی صورت میں سامنے آئی کہ اس کے کئی ترکی کے حوالے ہی رہے۔ یونان کی آزاد ہونے والی ریاست کو آزادی کے بعد بھی کئی علاقے نہ ملنے کی وجہ سے یونانی آبادی کے ایک بڑے حصے کو آزادی کے بعد بھی ترکوں کے رحم و کرم پر بھی چھوڑ دیا گیا۔ اس کے پس پشت بھی برطانیہ کے مفادات تھے جس کا اظہار برطانیہ کے وزیر اعظم اور Duke of Wellington نے اپنے الفاظ میں اس طرح کیا کہ یونان بالآخر روس کی ایک سیٹیلائٹ ریاست بن کر رہ جائے گی اس لئے ضروری ہے کہ اس کو کم سے کم علاقہ دیا جائے (۶۴)۔ یونان کی آزادی کے بعد بھی عثمانی سلطنت کے لئے برطانوی تائید و حمایت (Commitment) میں کوئی کمی نہ آئی۔

ہندوستان میں برطانیہ کے لئے عثمانی خدمات

مسلمانان ہند کی طرف سے ترکی کے سلطان کو عالمگیر خلیفہ تسلیم کئے جانے کا واقعہ نسبتاً تاریخ کا تازہ واقعہ ہے۔ مغلوں کے لئے ترک سلطانوں کی بالادستی کسی بھی طرح قابل قبول نہ تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ طاقت، دولت اور سلطنت کے محل وقوع کے حساب سے سلطنت عثمانیہ کو اپنا حریف سمجھتے تھے جس پر کہ وہ قبل ازیں حکمرانی کر چکے تھے۔ یہ برطانوی دور میں ممکن ہو سکا کہ برطانیہ کی حوصلہ افزائی اور حمایت کے نتیجے میں ہندوستان کے مسلمانوں میں ترکی کے سلطان کو عالمگیری خلیفہ کے طور پر پیش کرنے کے لئے پروپیگنڈہ شروع کیا گیا اور مسلمانان ہند پر یہ زور دیا

گیا کہ اپنی وفاداریاں سلطنت عثمانیہ کے ساتھ جوڑیں۔ برطانیہ کو اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ مسلمانان ہند کو سلطنت عثمانیہ کا وفادار بنا کر نظریاتی اور مذہبی طور پر عثمانی خلیفہ کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں میں اپنے خلاف تحریک اٹھانے سے روک سکتا ہے۔ برطانیہ نے اس صورتحال کے ذریعے اپنے مفادات کی بہتر تکمیل ہوتے دیکھ کر عثمانی خلیفہ کی حمایت میں پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ اس کے بدلے خلیفہ نے بھی برطانیہ کے مفادات کی خوب خدمت کی۔ اس کی پہلی مثال اس وقت سامنے آئی جب ۱۷۸۹ میں ٹیپو سلطان نے مغلوں سے بغاوت کرتے ہوئے عثمانی خلیفہ سے اپنی وفاداری کا عہد کیا جس کے جواب میں خلیفہ نے اسے خلوت عطا کرتے ہوئے اسے میسور کا حکمران تسلیم کرلیا۔ واضح رہے کہ ٹیپو کی حیثیت اس ہیرو (legendary) کی ہے جسے ہندوستانی تاریخ میں برطانوی کے سامراجی اقتدار کے خلاف لڑنے والے مزاحمتی ہیرو کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ۱۷۹۸ میں برطانیہ کی درخواست پر عثمانی خلیفہ نے ٹیپو سلطان کو مراسلہ لکھا کہ جس میں خلیفہ نے برطانیہ کی سفارش کرتے ہوئے ٹیپو کو برطانیہ کے خلاف اپنے دشمنانہ رویے پر نظر ثانی کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ برطانیہ سلطنت عثمانیہ کا اتحادی تھا۔ یہ مراسلہ ٹیپو سلطان کو براہ راست نہ بھیجا گیا تھا بلکہ بالواسطہ طور پر Lord Wellesley کے ذریعے بھیجا گیا جو کہ حیرت انگیز طور پر ٹیپو سلطان سے لڑائی میں مصروف برطانوی فوج کی سربراہی کر رہا تھا۔ ٹیپو نے اپنے جوابی مراسلے میں خلیفہ سے اپنی وابستگی کا دوبارہ اعادہ کرتے ہوئے اسے بڑے ادب سے لکھا کہ چونکہ خلیفہ ہندوستان سے بہت دور بیٹھے ہیں اس لئے انھیں سیاسی معاملات سے مکمل آگاہی حاصل نہیں۔ اس نے (Cheekily) خلیفہ کو یہ دعوت دی کہ وہ اس کے ساتھ شامل ہو کر کافروں (infidels) کے خلاف جنگ میں اس کا ساتھ دے۔ ایک اہم موقع جب دوبارہ عثمانی خلیفہ برطانیہ کی حمایت میں سامنے آیا وہ تکلیف دہ مرحلہ تھا جب ہندوستان میں ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی شروع ہوئی۔ تاریخ دانوں نے اس لڑائی کی اہمیت کو کم کرتے ہوئے اسے ہندوستانی بغاوت (Mutiny) بھی کہا ہے۔ عثمانی خلیفہ عبدالمجید نے بغاوتیوں کے اس اقدام کی مزحمت کرتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ برطانیہ کے وفادار رہیں۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ برطانیہ "اسلام کا محافظ" ہے۔ برطانیہ کا خیال تھا کہ ہندوستان کے مسلمان کو قابو میں رکھنے کے لئے عثمانی خلیفہ کو استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اسی خوش فہمی میں انھوں نے Tyrant سلطان عبدالعزیز

کے ۱۸۶۷ کے دورہ لندن کے موقع پر اس کی خوب آؤ بھگت کی اور اس پر بے تحاشہ دولت لٹائی۔ اہم بات یہ ہے کہ خلیفہ کے اس دورے پر اٹھنے والا تمام خرچہ برطانوی حکومت نے ہندوستان سے حاصل ہونے والی آمدنی (Revenue) سے پورا کیا اور یہ خرچہ کرتے ہوئے یہ لکھا گیا کہ یہ خرچے اس لئے کئے جا رہے ہیں کہ سلطان کے ساتھ گرم جوشی کے تعلقات بحال کر کے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے لئے مزید آسانیاں پیدا کی جا سکیں گی۔ سلطان کو استعمال کر کے ہندوستانی مسلمانوں کو برطانیہ کے زیر استعمال لانے کی ایک اور کوشش کی جا سکتی تھی (۲۷)۔

مسلمانان ہند کے ترکی کے لئے ہمدردانہ رویئے کی تشکیل:

(Shapping of Pro-Turkish Atitudes of Indian Muslims)

انیسویں صدی کی ابتداء تک ہندوستانی مسلمانوں کا ترکی اور عثمانی خلافت کی طرف بیگانگی (largely indifferent) کا رویّہ تھا۔ برطانیہ کے مفادات سے قطع نظر دیگر دو اہم سماجی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں جنہوں نے مل کر ہندوستانی مسلمانوں میں ترکی کے لئے ہمدردانہ پروپیگنڈے کو آگے بڑھانے کا موقع دیا۔ ان دونوں تبدیلیوں کے جنم لینے کے پس پشت بالکل دو مختلف وجوہات تھیں لیکن اس کے درمیان کچھ نہ کچھ اندرونی تعلق تھا جس کی وجہ سے وہ ایک مرکز پر آ کر جمع ہو گئیں۔

ان میں پہلی چیز پڑھے لکھے درمیانے درجے کے مسلمان طبقے کا ابھر کر سامنے آنا تھا۔ مسلمانوں کا یہ طبقہ روایتی مدرسوں میں پڑھ لکھ کر سامنے نہ آیا تھا جہاں کے تعلیم کا عمل علماء آگے بڑھاتے تھے۔ یہ طبقہ برطانوی نظام تعلیم کے نتیجے میں آگے آیا تھا جس کو کہ نوآبادیاتی حکومت نے لارڈ میکالوے کی فروری ۱۸۳۵ کی تجاویز کے نتیجے میں متعارف کرایا تھا۔ اس نظام تعلیم کو اس مقصد کے تحت ترتیب دیا گیا تھا کہ اس کا کام نوآبادیاتی ریاست کے لئے افسر شاہی، کلرک اور صحافی پیدا کرنا تھا۔ ان کی ضرورت یہ تھی کہ وہ انگریزی بولنے والے صاحبوں اور مقامی آبادی کے درمیان رابطہ کا کام کر سکیں۔ نہرو نے اس نظام تعلیم کو ''کلرکوں کی قوم'' (Nation of Clerks) پیدا کرنے سے تعبیر کیا۔ نوکری پیشہ طبقہ درمیانے طبقے کا وہ حصہ تھا

جس کا اصل مقصد ریاست کی نوکری کا حصول تھا۔ان کا اصل مقصد "تعلیم" (Education) حاصل کرنا نہ تھا بلکہ ان کا مطمع نظر صرف "تعلیمی قابلیت" (Educational Qualification) یعنی سند اور ڈپلومہ حاصل کرنا تھا جو کہ انھیں سرکاری ملازمت دلانے کے لئے اجازت نامہ (Passport) بن سکتی ہو۔ایک نوآبادیاتی معاشرے میں جس کی بنیاد زرعی پیداوار پر تھی۔اس معاشرے میں تنخواہ دار طبقے نے بالآخر شہری معاشرے میں کلیدی کردار ادا کرنا تھا اور وہ سیاسی بحث ومباحثوں میں بھی نئی سمتوں اور موضوعات کا تعین کرتا تھا۔اس طرح تنخواہ دار طبقہ ایک اہم طبقہ بن کر ابھرا جس نے سماجی اور سیاسی طور پر بڑی اہمیت حاصل کرلی۔یہی وہ طبقہ تھا جو اخبار کا قاری بن گیا جب اخبار قابل خرید ہوگیا۔

مسلمان تنخواہ دار طبقہ خصوصاً یوپی (U.P) کے افراد وہ بدقسمت (disgruntled) طبقہ بن گیا جس کو ریاست کی ملازمتیں کھونی پڑیں خاص طور پر وہ مراعاتی اور اعلیٰ درجے کی ملازمتیں جس پر وہ اب تک بھاری تعداد میں قابض تھے۔نفسیاتی طور پر اس طبقے کو اس راستے (Avenues) کی تلاش تھی جس کے ذریعے وہ اپنی تکالیف اور محرومیوں کا اظہار کرسکتے۔اسی دوران جب ترکی کی بلقان میں پے در پے شکستوں کی خبریں آنے لگیں اور ان خبروں کو ان تک عیسائیوں کے ہاتھوں عالم اسلام کی شکست سے تعبیر کرکے پہنچایا جانے لگا تو اس موسیقی نے ان کے پہلے سے مذہبی پراگندہ ذہنوں (communalist minds) کو مزید گندہ کرنا شروع کردیا۔"ترکی کی تقدیر" ایک وہ آئینہ تھا جس میں وہ اپنی تباہی کا درد محسوس کرسکتے تھے۔"ترکی کے المیہ" کو دیکھتے ہوئے انھوں نے ترکوں سے اپنی دلی ہمدردی کا مظاہرہ کیا۔اس کے نتیجے میں ایک نہایت طاقتور اتحاد (Solidarity) کا رویہ پیدا ہوا اور انھوں نے ترکی کے لئے امداد اکٹھا کرنا شروع کردی۔برطانیہ نے اس رویئے کو نہ صرف کشادہ دلی سے خوش آمدید کہا بلکہ اس کی بھرپور طریقے سے حوصلہ افزائی کی جتنی ان سے ممکن تھی۔وہ ہندوستانی مسلمانوں اور اس کے سرپرست (Protege) عثمانی خلیفہ کے درمیان بڑھتے ہوئے اس تعلق پر بہت خوش تھے۔

ایک اور اہم سیاسی بنیاد جس کے باعث سلطنت عثمانیہ کے لئے ہمدردی کے جذبات بڑی تیزی سے سامنے آئے وہ مقبول (Popular) اردو صحافت کا ابھر کر سامنے آنا تھا۔اس سے پہلے کے اخبارات بڑی محدود اشاعت رکھتے تھے اور وہ بھی مراعات یافتہ طبقوں اور کاروباری افراد تک

مشتمل تھے جس میں زیادہ تر خبریں حکومت کے معاملات تک محدود ہوتی تھیں۔ اس میں سے زیادہ تر "اخبارات" موادتی (Manuscript) طرز پر ہوتے تھیں۔ اردو میں چھپائی بھی رواج پذیر تھی اور دھاتی نقش کا طریقہ بھی کچھ عرصے سے موجود تھا۔ لیکن نقش (naskh) کا طریقہ کار عوامی سطح پر زیادہ مقبول نہ تھا اور نسبتاً مہنگا بھی تھا جبکہ اس کے مقابلے میں خطاطی (Calligraphic) کا نستعلیق (nastalique) طریقہ کار زیادہ رواج پذیر اور مقبول عام ہو چکا تھا۔ جیسا کہ بعد میں یہ بات ہوئی کہ چھپائی کا سب سے بہترین اسکرپٹ نسبتاً لیگ لیتھوگرافی (lithography) ثابت ہوا اس نے مسلمان نوکری پیشہ ورانہ میں بڑی مقبولیت حاصل کر لی حالانکہ لیتھو پرنٹنگ پریس کی ایجاد ۱۷۹۶ میں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ اسے اخبارات کو کثیر تعداد اور نسبتاً ارزاں قیمت میں چھاپنے کے لئے استعمال کیا جاتا اس میں بہتری لانے کی شدید ضرورت تھی۔ ۱۸۵۰ تک پہلی میکانائز لیتھو پرنٹنگ پریس کا استعمال عام ہو گیا اور انیسویں صدی میں یہ تبدیل ہو کر روٹری مشینوں نے لے لی جبکہ اس کی جگہ پر پرانی مشینیں جو کہ زنک پلیٹ کے پتھر کے ذریعے استعمال کی جاتی تھی ان کا استعمال ختم ہو گیا۔ ان ایجادات نے لیتھولیگی پرنٹنگ کو نستعلیق رسم الخط میں نسبتاً ارزاں اور ممکن بنا دیا۔ اس ترقی کی وجہ سے اردو اخبارات کو کثیر تعداد میں چھاپنا اور قابل خرید بنانا ممکن ہو گیا اور وہ اب "ہر ایک" تک پہنچ سکتا تھا۔ اردو پریس کے لئے اب عام لوگوں تک پہنچنے کا دور آ چکا تھا۔ لیکن اخبارات کو ایسی چٹ پٹی خبریں چاہئے تھیں جو کہ ان کی اشاعت کو بڑھانے کا سبب بن سکے اور "ترکی کے المئے" کا ڈرامہ وہ شدید ضرورت تھی جو کہ ان اخبارات کو چاہئے تھی۔ انھوں نے اس ڈرامے کا بھرپور فائدہ اٹھایا جتنا کہ وہ اٹھا سکتے تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے واقعات ہندوستانی مسلمانوں کے لئے شدید صدمہ کا باعث تھے۔ وہ اس ماحول میں پل کر بڑے ہوئے تھے جہاں برطانیہ اور سلطنت عثمانیہ کی دوستی کا تذکرہ معمول کی بات تھی اور اردو پریس میں اس کی بھرپور جھلک دیکھنے کو ملتی تھی۔ اس تناظر میں پہلی جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ اور برطانیہ کا ایک دوسرے کے مخالف ہونے کی خبریں ان کے لئے شدید پریشانی اور صدمے کا باعث بنیں۔ کسی اور خبر سے زیادہ مولانا محمد علی کا ایک طویل آرٹیکل بعنوان ''ترکوں کا انتخاب'' (The Choice of the Turks) ان کے اخبار کامریڈ (Comrade) میں شائع ہوا۔ اپنے اس مضمون میں برطانیہ سے ترکوں کو لاحق دکھوں اور شکایات کا ذکر کرنے کے بعد انھوں

نے اس بات کی امید ظاہر کی کہ ترک اس لڑائی میں غیر جانبدار رہیں گے۔ انھوں نے اپنے مضمون کے اختتامیہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی حکومت برطانیہ سے وفاداری کا دوبارہ اعادہ کیا۔

ترکی اور جنگ عظیم اول

ترکوں کی طرف سے پہلی جنگ عظیم میں جرمنی اور دیگر طاقتوں کی حمایت تمام لوگوں بالشمول ترکوں کے اپنے لئے بھی باعث حیرت تھی۔ ۱۹۰۸ میں ایک انتہاپسند (Radical Group) جسے کمیٹی برائے اتحاد وترقی (Committee for Union & Progress)(CUP) جسے عمومی طور پر نوجوان ترکی (Young Turks) کہا جاتا ہے۔ انہوں نے ایک بغاوت میں خلیفہ عبدالحمید دوئم کو ہٹا کر اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ اس کی جگہ پر CUP نے خلیفہ کے بھائی محمود رشید کو مسند پر بٹھا کر خلیفہ مقرر کر دیا۔ نوجوان ترک (Young Turks) کا اقتدار جلد ہی ایک فوجی مطلق العنانیت (Oilgracy) میں تبدیل ہوگیا۔ پس پردہ اقتدار کے حصول کے لئے تکونی لڑائی جاری تھی جس میں ایک خلیفہ تھے جسے قدامت پسند (conservatives) اور انتہا پسند (Reactionary) عناصر کی حمایت حاصل تھی جبکہ دوسری طرف اعلی نوکرشاہی تھی جنہیں روشن خیال مدد فراہم کررہے تھے جبکہ تیسری طرف انتہاپسندی اتحادی (Radical Unionist) تھے یعنی نوجوان ترک (۳۱)۔

اندرونی طور پر ترکوں کے حکمران اشرافیہ طبقے میں اختلاف ہونے کے باوجود برطانیہ کے حمایت میں وہ تینوں گروپ متفقہ طور پر اکٹھا تھے۔ یعنی ان تینوں کو پچھلی کئی صدیوں سے برطانیہ سے دوستی وراثت میں ملی تھی اور ان کا اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ جہاں تک ترک اشرافیہ کا تعلق تھا برطانیہ ان کے لئے سب سے قابل اعتماد اور مستقل دوست تھا۔ تمام فروعی اختلافات کے باوجود ترکی اشرافیہ میں کوئی ایسا گروپ نہ تھا جو کہ برطانیہ کی حمایت نہ کررہا ہو۔ اس صورتحال میں ترکی کا پہلی جنگ عظیم میں اپنے گزشتہ اتحادیوں برطانیہ اور فرانس کے ساتھ طویل دوستی کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے وسطی طاقتوں یعنی جرمنی اور آسٹریا ہسبرگ ریاستوں کے ساتھ اتحاد بنانا بالکل ایک دلچسپ اور انوکھی بات تھی۔ ابتدائی طور پر ترکی نے خود برطانیہ اور دیگر اتحادیوں کو جنگ میں ان کے ساتھ شریک ہونے اور ان کا اتحادی بننے کی درخواست کی۔ فیروز احمد لکھتے ہیں کہ

بلقان کی بھیانک جنگوں میں خارجہ پالیسی کی ناکامی کے بعد CUP کو اس بات کا یقین تھا کہ عثمانی سلطنت کا بچنا صرف اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ جنگ کے ان دونوں بلاکوں میں سے کسی ایک کا اتحادی بن جائے اوران کی خواہش یہ تھی کہ وہ برطانیہ، فرانس اور روس کے بلاک کا حصہ بنے" اس سلسلے میں ترکی نے اپنے ایلچی برطانیہ، فرانس اور آخر کار روس کے زار نیکولس کے پاس بھی بھیجے۔ ترکی کے یونینسٹ برطانیہ اور فرانس کے حمایتی تھے اور کسی بھی صورت میں جرمنی کے حمایتی بننے کے خواہش مند نہ تھے کیونکہ ان کو یقین تھا کہ ان کے مفادات کا بہتر طور پر برطانیہ اور فرانس ہی تحفظ کر سکتے ہیں۔ لیکن برطانیہ کے ساتھ ترکی کی طویل دوستی اور اتحاد جس میں یقیناً اس کے اپنے مفادات کو بڑا اہم دخل حاصل تھا۔ اس کے باوجود ان مغربی قوتوں نے اپنے اتحاد میں ترکی کے شامل ہونے کی درخواست کو رد کر دیا۔ انھوں نے آخر ایسا کیوں کیا؟

اس بارے میں کچھ اشارے آغا خان کی خودنوشت میں ملتے ہیں جس میں انھوں نے ترکی کے اس فیصلے پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ برطانیہ نے ترکی کی درخواست کو رد کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی خواہش تھی کہ ترکی کو اس جنگ میں شامل ہونے کی بجائے خود کو غیر جانبدار رکھنا چاہئے۔ آغا خان لکھتے ہیں کہ:

> "لارڈ کچنر (Kitchener) نے ان سے درخواست کی وہ اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے ترکوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ وسطی طاقتوں کا اتحادی بننے کی بجائے اپنی غیر جانبداری کو برقرار رکھے۔ لارڈ کچنر کے ان خیالات کی حمایت اس وقت کے سیکریٹری آف اسٹیٹ برائے انڈیا اور سیکریٹری خارجہ امور سر ایڈورڈ گرے اور برطانوی وزیر اعظم مسٹر Asquith نے بھی کی۔ حد تو یہ ہے کہ ایسے ہی خیالات کا اظہار مجھ سے بادشاہ نے بھی اس موقع پر کیا جب مجھے ان کے ساتھ بعد ازاں ایک ظہرانے میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی (۳۴)"۔

اُن ہدایات کے بعد آغا خان نے لندن میں ترکی کے سفیر اور اپنے پرانے دوست توفیق پاشا سے ملاقات کی اور انھیں برطانوی حکومت کے خیالات سے آگاہ کیا۔ وہ دونوں اس بات سے متفق ہوئے کہ ترکی کو اس جنگ سے دور رہنا چاہئے۔ جوان ترک کو اس بات کی دعوت دی گئی کہ وہ

برطانیہ سے براہ راست بات چیت کے لئے لندن اپنے وزراء پر مشتمل ایک وفد بھیجیں۔ آغا خان لکھتے ہیں کہ:

> ''برطانیہ نہ صرف خود بلکہ روس کی طرف سے بھی یہ یقین دہانی کرائے کے لئے تیار تھا کہ مستقبل میں ترکی کے تمام مفادات کا خیال رکھا جائے گا۔ آغا خان لکھتے ہیں کہ اس غیر جانبدارانہ رویئے سے کئی فائدے حاصل ہو سکتے تھے ایک تو حالیہ عرصے میں ترکی کو جو نقصانات اٹھانا پڑے تھے جن میں نہ الجھنے کے باعث وہ سماجی ترقی، اقتصادی اصلاحات اور فوجی بہتری کے لئے تن دہی اور پوری توجہ سے کام کر سکتا تھا۔ اس خیال میں عقل مندی پوشیدہ تھی۔''

ترکی کے سفیر توفیق پاشا نے اس دوران ترکی کی اپنی حکومت سے رابطہ رکھا اور بعد ازاں آغا خان کو مطلع کیا کہ حکومت ترکی کا خیال یہ ہے کہ زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ اگر برطانیہ اور اس کے اتحادی ترکی کو جنگ میں غیر جانبدار رکھنے کی بجائے اس کو اس جنگ میں شریک کر کے اور اس کو اپنا اتحادی بنالیں کیونکہ غیر جانبدار رہنے کی وجہ سے جنگ کے اختتام پر کوئی بھی ملک ترکی کی غیر جانبداری پر اس کا شکر گزار نہ ہوگا لیکن نوجوان ترکوں نے اس بات پر غور نہ کیا کہ ہارنے والی قوتوں کے ساتھ اتحاد بنانے کے بجائے غیر جانبداری شاید اتنا برا سودا نہ ہوتا اور یقیناً وہ جانبداری جو جیتنے والی قوت کے مشوروں پر اختیار کی جا رہی ہے۔

یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ برطانیہ نے اپنے اتحاد میں ایک اضافی اتحادی کے شامل ہونے کی درخواست کو کیوں رد کر دیا۔ اس اتحاد میں ترکی کو شریک کرنے کے پس پشت دیگر مسائل میں ایک مسئلہ زار روس کا تھا۔ روس کے ترکی کے خلاف روایتی دشمنانہ رویئے کی وجہ سے اس بات کے قوی امکانات تھے کہ ترکی کو اتحاد میں شامل کرنے کی وجہ سے روس اس اتحاد سے الگ ہو جاتا جس کے باعث برطانیہ کو جرمنی جیسی ابھرتی ہوئی طاقت کا تنہا مقابلہ کرنا پڑتا۔ یہی وجہ تھی جس کی وجہ سے برطانیہ کوئی رسک لینے کو تیار نہ تھا۔ توفیق پاشا کا بھی یہی خیال تھا کہ روس کسی بھی صورت میں اس اتحاد میں ترکی کے شامل ہونے کو آسانی سے قبول نہیں کرے گا کیونکہ اس طرح ترکی کے علاقوں میں روس کی توسیع پسندی کے تمام منصوبے خاک میں مل جاتے۔ ان حالات میں

برطانیہ کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا کہ وہ ترکی کی طرف سے فراخ دلی کے ساتھ جنگ لڑنے کی پیشکش کو ٹھکرا دے۔ ترکی کو اس اتحاد میں شامل کرنے کا مطلب روس سے دشمنی مول لینا تھا، اور اس طرح برطانیہ کو روس کے غیر جانبدار بن جانے کے بعد تنہا جرمنی سے مقابلہ کرنا پڑتا جو کہ اس کے لئے بڑا مشکل ہوتا۔

برطانیہ نے عثمانیوں کی متواتر درخواستوں کو باوجوہ بڑی نرمی سے مسترد کر دیا۔ اس کے نتیجے میں ترکی کی حکومت نے ابتدائی طور پر "انتظار اور دیکھو" کی پالیسی کا طریقہ اپنایا نہ کہ فوری طور پر جرمنی کا اتحادی بننے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی انھوں نے بڑی سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جرمنوں کے خلاف بھی کسی طرح کی دشمنانہ (Hostilites) سے بچنے کی کوشش کی۔ اس طرح وہ اپنے تمام راستے کھلے رکھنا چاہتے تھے۔ اسی دوران جبکہ ترکی میں اس موضوع پر غور و فکر چل رہا تھا کہ انھیں کسی اور فریق کا ساتھ دینا چاہئے یا غیر جانبدار رہنا چاہئے، اکتوبر ۱۹۱۴ میں ترکوں نے یورپ کی ایک بڑی جنگ میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ آغا خان لکھتے ہیں کہ ۱۹۱۴ کے اختتام تک وسطی طاقتوں کو یقین تھا کہ وہ جلد ہی اپنی شرائط و ضوابط پر کامیابی کر لیں گی۔ بد قسمتی سے وسطی قوتوں کے ان دعوؤں، خود اعتمادی اور خوش فہمیوں سے متاثر ہو کر ترکی نے ایک نا قابل واپسی قدم اس وقت اٹھایا جب اس نے روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ترکی کی سلطنت کے اس اقدام نے قدرتی طور پر اسے برطانیہ اور فرانس سے بھی جنگ میں الجھا دیا۔ اگر ترکی کے اس قدم کو دیکھا جائے کہ تو یہ بات واضح ہوگی کہ ترکوں نے یہ قدم اٹھا کر اپنے آپ کو بہت بڑی تباہی میں مبتلا کر دیا۔ یہ ایک ایسا فیصلہ تھا جس میں منطق کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس جنگ میں ترکی کے لئے غیر جانبدار رہنا ایک انتہائی عقل مندی کا فیصلہ ہوتا۔

خلیفہ بعد از جنگ اول:

(The Caliph After World War I)

نو جوان ترک (CUP) کے رہنما جنھوں نے ترکی کو اس خطرناک جنگ میں دھکیلا تھا بعد از جنگ ایک جرمن بحری جنگی جہاز میں بیٹھ کر فرار کا راستہ اپنا لیا۔ بعد ازاں ترکی کے نظام حکومت میں بڑے پیمانے پر اتھل پتھل کی گئی اور ۳۰ اکتوبر کو جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کئے گئے۔

جولائی ۱۹۱۸ میں CUP کے رہنماؤں کے نامزد کردہ جنگی خلیفہ محمد رشید کو اقتدار سے الگ کر کے اس کی جگہ محمد ولی الدین کو نیا خلیفہ مقرر کر دیا گیا۔ برطانیہ کے دوست ایک مرتبہ پھر صاحب اقتدار ہو گئے۔ اسکن (Askin) کے مطابق مارچ ۱۹۱۹ میں ترکی کے وزیر اعظم فرید پاشا نے برطانوی حکومت کو ایک فوری پیغام بھیجا جس میں اس نے لکھا کہ:

> "ان کی تمام امیدیں خدا اور اس کے بعد برطانوی حکومت سے وابستہ ہیں اور انھیں اپنی حکومت چلانے کے لئے مالی امداد کی ضرورت ہے اور یہ کہ وہ ہر اس شخص کو گرفتار کرنے کے لئے تیار تھے جو کہ برطانیہ کو مطلوب ہو" (۳۸)۔

جنگ کے دوران برطانیہ نے ترکی کے خلاف اپنے تمام پروپگنڈہ کا حدف جوان ترکوں (CUP) کو بنایا تھا اور خلیفہ کے خلاف کوئی بات نہ کہی گئی کیونکہ انھیں یقین تھا کہ انھیں جنگ کے بعد خلیفہ سے تعلقات کی بحالی کے لئے کوئی راستہ کھولنا ہوگا اس لئے اسے تنقید کا نشانہ نہ بنایا جائے۔ خلیفہ کو اس پروپگنڈے میں نہ الجھانے کے پس پشت برطانیہ کی تین وجوہات شامل تھیں۔ اول تو یہ کہ انھیں معلوم تھا کہ خلیفہ صرف نمائشی حکمران تھے اور اصل قوت نوجوان ترکوں (CUP) کے لیڈروں کے پاس ہی تھی۔ دوسرا یہ کہ برطانیہ کو یقین تھا کہ خلیفہ اور ترکی کے پرانے حکمران طبقوں کی ہمدردی مکمل طور پر برطانیہ کے ساتھ تھی اور وہ ہمیشہ ان کے ساتھ ہی رہے گی۔ برطانیہ کو یہ بات بھی معلوم تھی کہ خلیفہ کو اس بات کا یقین تھا کہ سلطنت عثمانیہ کا سب سے بڑا محافظ خود برطانیہ تھا۔ تیسرا یہ کہ برطانیہ کو اس بات کا اب بھی یقین تھا کہ خلیفہ کے تمام عالم اسلام کے سربراہ ہونے کے دعوے کو مناسب وقت پر اپنے حق میں استعمال کر سکتا تھا جس طرح ماضی میں وہ کرتا آیا تھا۔ خلیفہ ماضی میں بھی برطانیہ کے لئے قیمتی اثاثہ رہا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ مستقبل میں بھی اس اثاثے کو اپنے حق ہی میں رکھے۔

جنگ کے اختتام پر نوجوان ترکوں کے سربراہوں کی فرار کے ذریعے اختیار کی جانے والی خود ساختہ جلاوطنی کے باعث ترکی میں طاقت کا ایک خلا پیدا ہو گیا۔ اس خلاء کو ترکی کے پرانے روایتی حکمران طبقے نے خلیفہ کے ساتھ مل کر بھرا۔ یہ صورت حال برطانیہ کی خواہش کے عین مطابق تھی۔ اب ان کا مرہون منت گروپ دوبارہ صاحب اقتدار تھا۔ ہندوستان کے خلافتیوں

کے تمام دعوؤں کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ جنگ کے بعد برطانیہ اس بات پر مکمل طور پہ کار بند تھا کہ وہ خلافت کے ادارے اور خلیفہ کو نہ صرف مستحکم رکھے بلکہ ملک کے اندرونی اور بیرونی معاملات پر خلیفہ کے اختیار کو دوبارہ بحال کرایا جائے ۔ برطانیہ کو نمائشی خلیفہ کا دشمن ہونے کا مورد الزام ٹھہرا کر ہندوستانی خلافتی درحقیقت ایک خیالی دشمن سے لڑائی کر رہے تھے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ خلیفہ کو اصل خطرہ برطانیہ سے نہیں بلکہ طاقتور ترکی کے عوامی قوم پرستوں کی طرف سے تھا جو کہ سیکیولر اور جمہوریت کے خواہش مند تھے۔ جبکہ اصل صورتحال یہ ہے کہ خلافتی اس قابل ہی نہ تھے کہ وہ ترکی کے اندر مطلق العنان خلیفہ اور جمہوری خیالات رکھنے والے عوامی نیشنلسٹوں کے تاریخی تصادم کو سمجھ سکیں۔ خلافتیوں کی تضادی سوچ اور ان کی الجھنوں کی صورتحال یہ تھی کہ ایک وقت میں انھوں نے مصطفیٰ کمال کو غازی پکارنا شروع کر دیا۔ جبکہ اسی وقت، انہوں نے قابل احترام (venerated) خلیفہ کے کردار کو بھی بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی کوشش کی۔ انھیں اس بات کا اندازہ ہی نہ تھا کہ یہ دونوں قوتیں ترکی کے معاشرے اور سیاست میں ایک دوسرے کے شدید مخالف عناصر تھے۔ خلافتیوں کی طرف سے اس صورتحال کو سمجھنے میں ناکامی ایک ناقابل یقین بات ہے۔

انتولیا (Anatolia) میں ترکی کی ایک نئی ریاست ابھر کر سامنے آ رہی تھی۔ یہ نئی قیادت ان افراد پر مشتمل تھی جنھوں نے معاہدہ سورس (Treaty of Sevres) کو مکمل طور پر مسترد کر دیا تھا اور ان تمام شرائط کو بھی جو کہ اسی کے ساتھ منسلک تھیں۔ اس نئی قیادت نے ان تمام ترکوں کو غدار کہنا شروع کر دیا جنھوں نے اس معاہدے کو تسلیم کر لیا تھا۔ ہندوستانی خلافتیوں نے ترکی کے ساتھ معاہدہ سیورس میں ہونے والی زیادتیوں پر مگرمچھ کے آنسو بہائے۔ لیکن انھیں یہ بات پتا نہ چلی کہ ان زیادتیوں کے ازالے کے لئے ان کے "محبوب خلیفہ" نے تو کچھ نہ کیا اور خاموشی سادھ لی لیکن ان شرائط کے خلاف کامیاب احتجاج تو عوامی قوم پرستوں نے بلند کیا۔ یہ خلافتی "خلیفہ کی تقدیر" کے رونے دھونے میں اس قدر الجھ گئے کہ وہ ترکی میں نئی اُبھرنے والی حقیقتوں کو سمجھ ہی نہ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ نمائشی (Supine) خلیفہ نے تو معاہدہ سورس کی وہ تمام کڑی شرائط جو کہ Lloyd George کے متعصبانہ رویوں کی وجہ سے عائد کی گئی تھیں انھیں خاموشی سے تسلیم کر لیا تھا لیکن قابل ستائش ہیں وہ قوم پرست کہ جن کی جدوجہد کے نتیجے میں

معاہدہ سورس ایک مردہ دستاویز بن گئی اور قوم پرستوں نے جنگ عظیم کی فاتح اقوام کے ساتھ دوبارہ ایک نیا اور باعزت معاہدہ لائسنے (Lausanne) کے مقام پر ۲۰ نومبر ۱۹۲۲ میں ہونیوالی ایک امن کانفرنس میں طئے کیا۔ لارڈ کرزن کے الفاظ میں (جسے "مولانا" محمد علی نے بھی رقم کیا ہے) معاہدۂ سورس وہ ظالمانہ شرائط تھیں جو کہ فاتح اتحادیوں نے ایک شکست خوردہ قوم پر بندوق کی نوک پر زبردستی تھوپی تھیں۔ یہ شرائط ایسے فیصلوں پر مشتمل تھیں کہ جب کسی مجرم کو گرفتاری کے بعد اس کے جرم کی اپنی خواہش کے مطابق سزا سنادی جائے جبکہ لائسنے میں ترکوں نے مذاکرات میں برابری کی بنیاد پر جنگ کے دیگر اتحادیوں سے بات چیت کی (۳۹)۔

خلیفہ کے خلاف برطانوی سازشیں

۹ نومبر ۱۹۱۸ کو جب خلیفہ اور اس کے درباریوں نے دوبارہ اقتدار سنبھال لیا تو استنبول میں برطانیہ کے نئے مقرر شدہ سفیر کلتھورپے (Calthorpe) نے برطانوی وزیر خارجہ لارڈ بیلفور (Lord Balfour) کو لکھا:

> "ترکی کے وزراء اپنے آپ کو برطانیہ کے حقیقی دوست ثابت کرنے کی کوشش کریں گے اور آپ کی ہمدردیاں جیتنے کی کوشش بھی جاری رکھیں گے (۴۰)"۔

ں نے اپنے خط میں اپنی حکومت کو مزید لکھا کہ خلیفہ تمام مسلم دنیا کے حوالے سے ایک انتہائی اہم کردار ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ترکی کے اپنے لئے بھی۔ اس نے اپنے خط میں مزید لکھا کہ خلیفہ کی یہ خواہش ہے کہ برطانیہ ترکی سے اپنے تعلقات دوبارہ پوری طرح بحال کرلے (۴۱)۔

رطانیہ کی حمایت سے خلیفہ کی حکومت نے نوجوان ترکوں اور اس کے بعد ابھر کر سامنے آنے والی عوامی قوم پرستوں کی قوت سے ٹکر لینے کا فیصلہ کیا۔ اب ترک سلطان اور اس کے وزیروں کے لئے سب سے اہم کام بچے کھچے نوجوان قوم پرست ترکوں کا خاتمہ تھا (۴۲)۔ اسی سلسلے میں نئی عوامی قوم پرست تحریک کو جو کہ مصطفیٰ کمال کی زیر قیادت کام کررہی تھی اسے فیصلہ کن انداز میں دبانے کی کوشش شروع کی گئی۔ برطانیہ اور سلطان کے ہمدردوں کا خیال تھا کہ قوم پرست ان کے

خلاف کارروائی کرنے کے لئے اکٹھا ہو رہے تھے۔ جولائی ۱۹۱۹ میں مصطفیٰ کمال نے کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لئے تمام اضلاع سے وفود طلب کئے جنھوں نے مل کر عظیم قومی عوامی اسمبلی (Popular Grand National Assembly) کی بنیاد رکھی جس نے اپریل ۱۹۲۰ میں اپنا کام شروع کیا اور اسی نے ترکی کو موروثی نظام سے آزادی دلانے کی کوشش کی۔ اس صورت حال کے باعث اتحادیوں اور ان کے پٹھو خلیفہ کے کان کھڑے ہو گئے۔ اگست ۱۹۱۹ میں ایک اعلامیہ " ملی میثاق(Milli Misak) یا قومی معاہدہ(National pact) جاری کیا گیا۔ ستمبر میں دوسری عوامی قومی اسمبلی کی کانگریس میں مصطفیٰ کمال کو اس کا چیئر مین مقرر کیا گیا۔ اس طرح قومی جدوجہد حقیقی اور درست سمت میں شروع ہو گئی۔

برطانیہ نے اپنے دوست خلیفہ کو جو کہ انھیں بڑے عرصے سے مدد کے لئے پکار رہا تھا اسے قوم پرستوں کے ممکنہ انقلاب اور اقتدار سے محروم کئے جانے سے بچانے کے لئے بالآخر اپنی فوجیں ٦ مارچ ۱۹۲۰ کو استنبول میں داخل کر دیں۔ واضح رہے کہ یہ فوجیں جنگ عظیم اول کے ختم ہونے اور خلیفہ کے دوبارہ بحال کئے جانے کے ۱۸ ماہ بعد بھیجی گئیں تھی جبکہ خلیفہ اس سے قبل ہی جنگ کے بعد دوبارہ اقتدار میں بحال ہو چکا تھا اور قوم پرستوں کے خلاف بڑی بھرپور کارروائی میں مصروف تھا۔ دیگر موقع اور مفاد پرست مُلاّؤں کی طرح اس بار بھی شیخ الاسلام عبداللہ آفندی نے وزیر اعظم کے داماد فرید پاشا کی درخواست پر اپنی پرانی روایات کے عین مطابق خلیفہ کی حمایت اور قوم پرستوں کی قومی جدوجہد کے خلاف فتویٰ صادر کرتے ہوئے یہ کہا کہ قوم پرستوں کو قتل کرنا تمام مسلمانوں کے لئے مذہبی ذمہ داری میں شامل ہے۔ اسی فتوے کا ہدف مصطفیٰ کمال خود بھی تھے جن کے خلاف پہلے ہی خلیفہ کی ایک عدالت موت کا پروان جاری کر چکی تھی۔ ہندوستانی خلافتی جو کہ بیک وقت جہاں ایک طرف خلیفہ کی حمایت کر رہے تھے تو دوسری طرف مصطفیٰ کمال کے کردار کو ہیرو کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ اس نئی صورتحال میں انھوں نے چپ سادھ لی ترکی کی فوج نے قوم پرستوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کو دیکھتے ہوئے خلیفہ پر مزید یقین کرنا درست نہ سمجھا۔ خلیفہ نے فوج کا رویہ دیکھتے ہوئے فوجوں سے ہتھیار واپس لینا شروع کر دئے۔ خلیفہ کے خلاف کسی بھی عوامی بغاوت کو روکنے کے لئے برطانیہ کی مدد سے ایک خصوصی فورس " قوت برائے نظم اور کنٹرول"(quwwaindibatiye)

ترتیب دی گئی جس کا مقصد قوم پرستوں سے مقابلہ کرنا تھا لیکن اس کے برعکس قوم پرست مضبوط سے مضبوط تر ہوتے چلے گئے۔

مصطفیٰ کمال "برطانیہ کے دوستوں" پر:

Kemal on "The Friend of England"

قوم پرستوں کے شدید دباؤ کے باعث خلیفہ کو اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے برطانیہ کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ مصطفیٰ کمال نے اکتوبر ۱۹۲۷ میں اپنی مشہور زمانہ تقریر ''چھ روزہ تقریر'' (6 day speech) میں انجمن برائے دوستگان برطانیہ (Society of friends of England) کے متعلق اظہار خیال کیا۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ انجمن کچھ بھٹکے ہوئے لوگوں نے بنائی تھی۔ اس نے مزید کہا کہ "اس انجمن کی سربراہی میں وہ وحدتی (Vahdettin) شامل تھے جن کے القابات میں عثمانی سلطان اور خلیفہ، دامت فرید پاشا (وزیراعظم)، علی کمال، وزیر داخلہ جیسے لوگ شامل تھے...." (کمال نے انجمن کے دیگر سرکردہ رہنماؤں کے نام بھی لئے جن کا تعلق گزشتہ حکومت سے تھا)۔ کمال نے انجمن پر یہ الزام بھی لگایا کہ "انجمن نے کھلے عام انگلستان کی پناہ اور مدد چاہی اور اس نے خفیہ طور پر عوام کو قوم پرستوں کے خلاف کھڑا کرنے کی کوشش کی تا کہ ملک میں افراتفری پیدا کر کے بیرونی مداخلت کو موقع فراہم کیا جا سکے" (۴۵)۔

مصطفیٰ کمال نے واضح الفاظ میں یہ بات کہی کہ اس حالت میں جبکہ قوم کو کوئی رہنمائی فراہم کرنے والا نہ تھا اور بادشاہ اپنے تمام وسائل کے ساتھ سازشوں میں مصروف تھا اور یہ صورتحال ملک کے لئے تباہ کن ہو سکتی تھی ان حالات کو دیکھتے ہوئے ہمیں اندازہ ہو گیا کہ اگر ملک کو بچانا ہے تو خلافت کے پرانے نظام کو ختم کرنا ہوگا اس نے مزید کہا کہ ملک کے مذہبی پیشوا مذہب کا نام استعمال کرتے ہوئے صدیوں سے خلیفہ کے اقتدار کو بچانے کے لئے تمام حربے استعمال کرتے رہے تھے۔ اس لئے اب اس کے بھی خاتمے کی شدید ضرورت تھی۔ ہمیں مجبور کیا گیا کہ ہم عثمانی حکومت، بادشاہ اور خلیفہ کے خلاف بغاوت کریں اور عوام اور فوج کو اپنے ساتھ ملا کر بغاوت کر دیں (۴۹)۔ مصطفیٰ کمال نے یہ بات بھی واضح کی کہ انھوں نے خلافت کے نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ تو عوامی انقلاب کے ابتدائی دنوں میں ہی کر لیا تھا

لیکن لڑائی کی حکمت عملی کی ضرورت یہ تھی کہ صورتحال کو اپنے حق میں تبدیل کرتے ہوئے خلافت کا آہستہ آہستہ خاتمہ کیا جائے۔ حد تو یہ ہے کہ اپنے قریبی ساتھیوں کو بھی اپنے خیالات سے آگاہ نہ کیا کیونکہ ہر فیصلے کا اعلان مناسب وقت پر ہی کیا جانا ہی بہتر ہوتا ہے اور یہ موقع بالآخر ۱۹۲۴ میں آیا (۵۰)۔

مصطفیٰ کمال کے اس بیان سے تو یہ بات بالکل عیاں تھی کہ خلیفہ برطانیہ اور دیگر یورپی طاقتوں کے ساتھ خفیہ سازشوں میں ملوث تھے۔ برطانیوں نے خلیفہ کو ترکی کے قوم پرستوں کے خلاف ڈھال کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی۔ برطانیوں کا مفاد اسی میں تھا کہ وہ قوم پرستوں کے مقابل خلیفہ کو ترکی کی ریاست میں مرکزی مقام پر فائز رکھیں۔ برطانیہ کی اس روایتی پالیسی کو وقتی طور پر رخنے کا سامنا جنگ عظیم کی مخلوط حکومت اور خصوصاً لارڈ جارج (Lloyd George*) اور اسکوئتھ (Asquith*) کی ترک مخالف اور یونان کے لئے حمایت کی پالیسیوں کے باعث آیا۔ یہ دونوں وہ لوگ تھے جو کہ اس وقت جنگ کے دوران برطانیہ کی مخلوط حکومت کی سربراہی کر رہے تھے اور انہیں جنگ کے فوراً بعد اقتدار سے محروم ہونا پڑا اور ان کی جگہ قدامت پرستوں (Conservative) کی حکومت بونر لاء کی سربراہی میں بن گئی۔ بونر حکومت کے انتظام سنبھالنے کے بعد برطانیہ نے اپنی ترکی اور خلیفہ کی حمایت کی روایتی پالیسیوں کا دوبارہ اجراء کر دیا لیکن کچھ نئی تبدیلیوں کے ساتھ اس بدلی ہوئی صورتحال میں جسے برطانیہ نے فرانس کے ساتھ مل کر تشکیل دیا تھا اس کے تحت ترکی کو اس کی عرب کی نوآبادیات سے محروم کرتے ہوئے عرب کے ان علاقوں کو آپس میں تقسیم کر لیا۔

عرب کا علاقہ اور برطانیہ کی علاقے کے بارے میں ترجیحات میں تبدیلی:

(Arabia: A Change in British Geopolitical Priorities)

برطانیہ اب تک اس بات کا خواہش مند تھا کہ وہ اپنے دوست عثمانی خلیفہ کو ترکی میں حکمران کے طور پر برقرار رکھوائے۔ لیکن جنگ برطانیہ کی عثمانیوں کے لئے روایتی حمایت کی پالیسی میں چند تاریخی وجوہات کی بناء پر تبدیلی لے آئی تھی۔ برطانیہ کے ترکی سے صدیوں کے دوستانہ روابط زار روس کے توسیع پسندانہ عزائم کے پیش نظر تھے۔ جنگ عظیم اوّل سے قبل تک عثمانی ترکی روس

کے جنوب کی طرف بڑھنے کے عزائم میں سب سے بڑی دیوار تھا۔ ۱۹۱۷ کے روس کے کمیونسٹ انقلاب نے سارے علاقے کے نقشے میں بنیادی تبدیلیاں کردی تھیں۔ اب اس علاقے کے بارے میں نئے نقشے اور نئی منصوبہ بندیاں سامنے آ گئی تھیں۔ سوویت یونین کی نئی قیادت نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنی ہمسایہ ریاستوں کے ساتھ زار کے دور میں کیے گئے غیر مساوی معاہدوں کو فوری طور پر ختم کرنے کا اعلان کیا۔ انھوں نے اپنے اعلان میں جنوب کی طرف توسیع پسندی کے عزائم کو مزید جاری رکھنے کا کوئی عندیہ نہ دیا اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے پاس ایسا کرنے کی صلاحیت بھی نہ تھی اور نہ ہی ان کی ایسی کوئی خواہش تھی۔ اس نئی صورتحال میں اب برطانیہ کو کسی مضبوط عثمانی سلطنت کی ضرورت نہ رہی جو کہ طاقتور روس کا سامنہ کرنے کے قابل ہو جو کہ اب تک ان کی ضرورت رہی تھی۔ اس کی ترجیحات اب مکمل طور پر بدل چکی تھیں۔

برطانیہ اور فرانس نے جنگ کے اختتام پر نئی جغرافیائی صورتحال کے تحت سلطنت عثانیہ کے عرب علاقوں کو اپنی نوآبادیاتی بناتے ہوئے انہیں آپس میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ لیکن اس وقت تک عربوں کی قومی جدوجہد کی تحریکیں اپنا وجود ثابت کر چکی تھیں اور ان کی واضح شکل سامنے آ چکی تھی۔ اب عربوں کی خواہش تمام نوآبادیاتی حکمرانوں سے نجات حاصل کرنا تھی۔ جبکہ ترکی کے نئے قوم پرست بھی عثمانی خلیفہ کی طرح عرب علاقوں پر اپنے نوآبادیاتی تسلط کو ہر قیمت پر برقرار رکھنے کے خواہش مند تھے۔ ہندوستانی خلافتیوں نے ترکوں کے ان دعوؤں سے متاثر ہو کر ترکوں کے عرب پر تسلط کی حمایت کرنا شروع کردی جو کہ اصولی طور پر عربوں کے حقِ خودارادیت کی قومی جدوجہد سے انکار کے مترادف تھا۔ جبکہ دوسری طرف عرب کے علاقے پہلے ہی برطانیہ اور فرانس کے زیر تسلط آ چکے تھے۔ ہندوستان کے خلافتیوں نے عرب علاقوں کو آزادی دینے کے بجائے انھیں دوبارہ ترکی کے حوالے کرنے کا نعرہ بلند کرنا شروع کیا جو کہ درحقیقت عرب علاقوں پر ترکی کے دوبارہ نوآبادیاتی تسلّط کو بحال کرنے کے مترادف تھا۔ خلافتیوں نے اپنے نعروں کے پس پشت یہ منطق بیان کی گئی کہ مسلمانوں کے مقام مقدسہ صرف مسلمان حکمران کے زیر اثر رہنا چاہئے۔ حالانکہ عرب بھی مسلمان تھے اور خلافتیوں کا عربوں کے ان کی آزادی کی جدوجہد میں ساتھ دینے کی بجائے ترکی کی حمایت کرنا ایک قابل مذمت بات تھی۔ ہندوستانی خلافتی جو کہ اپنے آپ کو ہندوستانی قوم پرست کہلوانے پر فخر

محسوس کرتے تھے ان کا عرب قوم پرستوں کے لئے یہ رویہ نہایت شرم ناک بات تھی۔ لیکن ان کے اس رویئے میں کوئی حیرت انگیز بات نہ تھی کیونکہ خلافت تحریک کی سربراہی جاہل اور دقیانوسی مسلمان Clergy اور بنیاد پرست علماء جن میں مولانا آزاد بھی شامل تھے وہ کر رہی تھی۔

ہندوستانی خلافتیوں نے عرب قوم پرستوں کی قومی جدوجہد کی تحریک کو جھٹلا کر عرب قوم پرست سے دھوکا (Betrayal) کیا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستانی خلافتیوں کا خود ترکی میں خلافت کی بحالی پر اصرار درحقیقت رجعت پسندی کے نظام کو دوبارہ بحال کرنے کے مترادف تھا۔ خلیفہ کی حمایت کر کے درحقیقت وہ ابھرتی ہوئی عوامی جمہوریت کی حمایت کرنے کی بجائے دقیانوسی اور Outmoded بادشاہت کی حمایت کر رہے تھے۔ یہ تحریک جہالت، تعصب اور احمقانہ سوچ پر مشتمل تھی جو کہ حقیقت سے آنکھیں چرا کر دوبارہ خلیفہ کے کردار کو بحیثیت مذہبی سربراہ کے بڑھاوا دینے کی خواہش مند تھی۔ ان کا عثمانی خلیفہ کی طرف یہ رویہ تاریخ کو توڑ مروڑ کر اور اس کو تنگ نظری سے دیکھنے کی وجہ سے سامنے آیا تھا اور اس صورتحال کے ذمہ دار آزاد سمیت دیگر تمام دقیانوسی علماء اور کلرجی (Clergy) کے افراد تھے۔

خلیفہ بطور برطانوی قیدی:

(The Caliph as Prisoner of the British)

ہندوستانی خلافتیوں نے اپنی تحریک کی بنیاد اس بات الزام پر رکھی تھی کہ برطانیہ نے جنگ کے اختتام پر خلیفہ کو ''قید'' کر دیا جس کے باعث اس کے اختیارات اور اس کے اپنے وجود کو شدید خطرات لاحق ہو گئے تھے۔ جبکہ ہم جانتے ہیں کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ حقیقی صورتحال یہ تھی کہ خلیفہ کو اصل خطرہ ترکی کے ابھرتے ہوئے عوامی قوم پرستوں کی طرف سے تھا۔ جبکہ دوسری طرف برطانیہ مکمل طور پر خلیفہ کا حمایتی اور اس کا سرپرست تھا اور وہ بھی خلیفہ کی طرح قوم پرستوں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور عوامی تائید سے سخت خوفزدہ تھا۔ اس مرحلے پر اہم سوال یہ ہے کہ ہندوستانی خلافتی کس طرح ترکی کی صورتحال پر ایک غلط نتیجے پر پہنچے؟

ترکوں کی عوامی قومی تحریک خلیفہ کے لئے براہ راست خطرہ تھی کیونکہ ان کی خواہش تھی کہ ترکی سے خلافت کا خاتمہ کر کے موروثی اقتدار کے نظام کا خاتمہ کیا جائے۔ جبکہ اس کے مقابلے

میں برطانیہ کی یہ خواہش تھی کہ خلافتی نظام کو ترکی میں جاری رکھا جائے۔ برطانیہ اور خلیفہ نے ترکی میں عوامی قوم پرستوں کے خطرے کا بیک وقت مل کر سامنا کیا۔ خلیفہ کے پاس صرف ایک ہی ہتھیار تھا جو کہ وہ عوامی قوم پرستوں کے خلاف استعمال کر سکتا تھا اور وہ تھا اسلامی نظریہ (Islamic Ideology) کا تحفظ جس کا کہ وہ اپنے آپ کو یقیناً نگراں (Guardian) تصور کرتا تھا۔ خلیفہ نے مذہبی پتہ (card) کھیلنے کی کوشش کی جو کہ یقیناً ایک بڑا قیمتی پتہ تھا۔ اس نے عوامی قوم پرستوں کو دہریئے اور خدا اور اس کے خلیفہ کا دشمن قرار دینے کا اعلان کیا۔ اس کو امید تھی کہ اس کے اس اعلان کے بعد ترکی کے لوگ ان عوامی قوم پرست رہنماؤں سے بدظن ہو کر اس کی حمایت شروع کر دیں گے۔

جب کہ دوسری طرف عوامی قوم پرست اپنی تمام تر تیز رفتار ترقی اور عوامی مقبولیت کے باوجود اب تک اپنی بڑی کامیابیوں کے ابتدائی مراحل میں تھے۔ انھیں خلیفہ کے پروپیگنڈہ سے خطرات محسوس ہونا شروع ہوئے۔ انھیں اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس مہم کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مصطفیٰ کمال کی تقریروں سے یہ بات واضح تھی کہ انھیں اندازہ تھا کہ اسلامی نظریہ بندی (Islamic Ideology) کو اب بھی ایک اہم طاقتور عنصر کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے اور خلیفہ اپنے پروپیگنڈہ کے ذریعے ان کے مقصد کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ فیروز احمد لکھتے ہیں کہ ترکی کے قوم پرستوں نے بڑی جدوجہد کے بعد خلیفہ کے مذہبی پروپیگنڈہ کو کنٹرول کرنے کی کوشش تھی کیونکہ انھیں مظلوم تھا کہ ترکی کے معاشرے میں اسلام کا گہرا اثر تھا۔ ترکی کے قوم پرستوں کے لئے یہ کام درحقیقت اس وقت آسان ہوا جب استنبول پر برطانیہ اور فرانس کی فوجوں نے مشترکہ طور پر قبضہ کر لیا۔ اب قوم پرستوں نے خلیفہ اور ترک سلطان کو عیسائی طاقتوں کے قیدی کے طور پر پکارنا شروع کر دیا جس کی آزادی کی شدید ضرورت تھی۔ برطانیہ اور فرانس کی فوجیں استنبول میں جنگ عظیم اوّل کے خاتمہ کے ۱۸ مہینے بعد ۱۶ مارچ ۱۹۲۰ کو داخل ہوئیں جبکہ خلیفہ اس وقت مکمل طور پر اقتدار پر اپنا قبضہ جما چکا تھا۔ عوامی قوم پرستوں کو اپنے (Counter Propaganda) پروپیگنڈے کے لئے بے شک کوئی مضبوط بنیادیں تو حاصل نہ تھیں لیکن درحقیقت یہ ایک نظریاتی جنگ تھی اور اس جنگ میں کسی بھی قسم کے ہتھیار کا استعمال خوش آئند تھا۔ برطانوی فوجیں استنبول میں اُس وقت داخل ہوئیں جب عوامی قوم پرست

اپنے لئے میدان ہموار کر رہے تھے۔اس لئے اس بات کا قوی خطرہ موجود تھا جو یقیناً بلا جواز بھی نہ تھا کہ خلیفہ کے خلاف عوامی بغاوت ہو سکتی ہے۔

عوامی قوم پرست اسی لئے ہی تو لڑ رہے تھے جبکہ برطانیہ ہر صورت میں خلیفہ کو تحفظ فراہم کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ ان کا حلیف تھا۔اگر برطانیہ واقعی خلیفہ کو "قیدی" بنانے کا خواہش مند ہوتا تو استنبول میں فوجیں ۱۸ ماہ بعد نہ بھیجتا بلکہ ڈیڑھ سال قبل بھیج چکا ہوتا جبکہ ترکی جنگ کے نتیجے میں شکست خوردہ تھا۔

اس صورتحال میں جبکہ ترکی کے عوام عوامی قوم پرستوں کے اس دفاعی پروپگنڈہ کے بارے میں جو کہ انہوں نے شروع کر رکھا تھا جس میں یہ دعوی کیا گیا تھا کہ خلیفہ برطانیہ کا قیدی بن چکا ہے، ایک اپنا نکتہ نظر بنا رہے تھے تو دوسری طرف ہندوستانی خلافتیوں نے اس تحریک کو گہرائی میں دیکھنے کی بجائے صرف ظاہری صورتحال کو دیکھتے ہوئے اپنے مطالبات خلیفہ کی بحالی تک محدود کر دیا۔ہندوستان کی خلافت تحریک کے لئے خلیفہ کی برطانوی قید سے آزادی ان کا مطمع نظر بن گیا۔دنیا دار عقلمند ہندوستانی مسلمان لیڈر اس بات کو تسلیم کے لئے تیار ہی نہ تھے کہ خلیفہ بھی برطانیہ کے ساتھ مل کر اپنے ہی ملک کی قوم پرست عوامی تحریکوں کے خلاف سازش میں ملوث ہو سکتا تھا۔جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مغربی طاقتوں اور خلیفہ کے مشترکہ مفادات اس میں پنہاں تھے کہ وہ مل کر ترک عوام کی تحریک کو کچل دیں۔اس بات کے شواہد حاصل کرنا ہندوستان کے خلافتی رہنماؤں کے لئے کوئی مشکل بات نہ تھی۔ان کے لئے یہ بڑا ہی آسان کام تھا۔اس کا سہل حل یہ تھا کہ وہ ایک وفد خود استنبول بھیج دیتے جو کہ وہاں کے حالات کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیتا۔اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے استنبول میں مختلف لوگوں کے ساتھ بڑے گہرے ذاتی مراسم پہلے سے ہی موجود تھے۔اس طرح اس معاملے کی اصل حقیقت کی تہہ تک پہنچنے میں کوئی مشکل نہ ہوتی لیکن انھوں نے ایسی کوئی کوشش ہی نہ کی۔اس صورتحال میں ان شکوک وشبہات کا پیدا ہونا بالکل صحیح لگتا ہے کہ درحقیقت دانستہ طور پر اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے خواہش مند ہی نہ تھے کیونکہ اس صورت حال سامنے آنے کی صورت میں ان کے اس غبارے سے ہوا ہی نکل جاتی جس کی بنیاد پر وہ تحریک چلانے کے خواہش مند تھے۔حقیقت تو یہ ہے کہ ملا اور مولانا اس تحریک کے ذریعے اپنے مفادات کے حصول کے خواہش مند تھے۔اس تحریک سے ان کے عزت مآب خلیفہ کو چاہئے کوئی

فائدہ پہنچایا نہ پہنچا ان کے اپنے مفادات بڑے احسن انداز میں پورے ہو رہے تھے۔ اس تحریک کے نتیجے میں یہ لوگ ہندوستان کی مسلمان سیاست میں سربراہی (Fore Front) کے منصب پر فائز ہو گئے اور ہندوستان کی سیکولر اور تعلیم یافتہ لیڈر شپ پس پشت چلی گئی۔ خلافت تحریک کی وجہ سے ہندوستان کی مسلمان کلرجی (clergy) اس قابل ہوئی کہ وہ ہندوستان کے سیاسی منظر نامے میں اپنے لئے ایک اہم مقام حاصل کر سکے جس کے لئے اس نے قوم پرستی کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ اس مرحلے پر انھوں نے اپنے لئے ایک سیاسی تنظیم بھی بنانے کا فیصلہ کر لیا جس کا نام انھوں نے جمعیت علمائے ہند رکھ لیا۔

ہندوستان خلافتی اور ترکی کے معاملے کی حقیقت:

(Indian Khilafists and Turkish Reality)

ہندوستان کے خلافتی ان قوتوں کی اصل اہمیت کا اندازہ ہی نہ لگا سکے جو کہ ترکی کی نئی صورتحال کی تشکیل نو کر رہیں تھیں اور نہ ہی ان اہم تبدیلیوں کا جو کہ اس وقت ظہور پذیر ہو رہی تھیں۔ قاضی محمد علی عباسی جو کہ نہ صرف اردو صحافت کا اہم نام تھے بلکہ اس وقت خلافت تحریک کی سیاست میں اہم کردار ادا کر رہے تھے، انکی ترکی کے حقیقی حالات سے ناآشنائی کی حالت یہ تھی کہ انہوں نے انہیں سماجی تبدیلیوں کو سمجھنے کے بجائے انہیں ذاتی رنجشوں اور باہمی تکرار کا نام دیتے ہوئے انہیں سازشوں سے تعبیر کیا (۵۲)۔ ایک طرف تو وہ مصطفیٰ کمال کی کامیابیوں اور خاص طور پر یونان کی فتح پر اسے غازی کے لقب سے بھی پکارتے ہیں اور دوسری طرف خلیفہ کی قسمت پر آنسو بھی بہاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عباسی لکھتے ہیں کہ مصطفیٰ کمال نے خلیفہ مسلمین کو چیلنج کیا جس کی وجہ سے سلطان بے یارو مددگار رہ گئے۔ بعد ازاں وہ اپنے فرنگی آقاؤں (مغربی طاقتوں سے) شکایت بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ انھوں نے ترکوں کی عوامی جدوجہد کو دبانے اور خلیفہ کو برقرار رکھنے کے لئے کوئی خاص کردار ادا نہ کیا (۵۳)۔ عباسی کے اس بیان سے ہندوستان کے خلافتیوں کی تحریک خلافت میں پائے جانے والے تضادات اور ان کے اس سادے معاملے سے لاعلمی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ انتہائی تکلیف دہ بات ہے کہ ہندوستان کا ایک انتہائی اہم خلافتی لیڈر جو کہ برطانوی کے نوآبادیاتی نظام کے خلاف لڑنے کا دعوے دار بھی ہو اور وہ

برطانیہ سے یہ شکایت کرتا نظر آئے کہ اس نے مداخلت کر کے ترکی کے قوم پرستوں کو شکست دینے اور "بے یارو مددگار" خلیفہ کو بچانے کے لئے کوئی کردار ادا نہ کیا۔ عباسی کا یہ تضادی رویہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ یہ رویہ درحقیقت عمومی طور پر ہندوستان کے تمام خلافتیوں کی اس جہالت اور صورتحال کو نہ سمجھنے کی عکاسی کرتا ہے جو کہ اس وقت ہندوستانی خلافتی قیادت کے ذہنوں میں خلافت کے متعلق پائی جا رہی تھی۔ یہ قیادت اس تاریخی جدوجہد اور حقائق کو سمجھ ہی نہ سکی جو کہ اس وقت ترک معاشرے میں مصروف عمل تھی۔ درحقیقت ترکی کے قوم پرست عوام کے کردار کو حقیقی معنی میں سمجھنا ان خلافتیوں کے بس سے ہی باہر تھا۔ انھوں نے کسی بھی مرحلے پر ترکی کی عوامی قوم پرست تحریک کی اہمیت کو سمجھا ہی نہیں اور نا ہی کسی مرحلے پر خلیفہ کے مقابلے میں انھوں نے ترک عوام کی عوامی جدوجہد کو قابل غور جانا۔

یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں کہ حکومت ہند نہ صرف تحریک خلافت کے لئے قابل برداشت رویہ رکھتی تھی بلکہ وہ اس کی مکمل طور پر حمایت بھی کر رہی تھی۔ حکومت برطانیہ ابتداء ہی سے خلافت تحریک کی بھرپور مدد کر رہی تھی اور اسے ایک اچھا مزہ (quite good humour) تصور کر رہی تھی تاوقتیکہ گاندھی کی سول نافرمانی کی تحریک نے اس کا رنگ بدل کر رکھ دیا۔ اس بات کی اہمیت کو بالکل نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ یہ بالکل وہی مرحلہ تھا جب خلافت تحریک نے کچھ جان پکڑنے کی کوشش کی تو عین اس مرحلے پر برطانیہ کی نوآبادیاتی حکومت نے جنگ عظیم اوّل کے دوران گرفتار کئے گئے رہنماؤں محمد علی، شوکت علی، آزاد اور ظفر علی خان جو کہ اس تحریک کی سربراہی کر رہے تھے اور اس تحریک کے بااثر افراد میں شامل تھے ان کو آزاد کر دیا۔ اس لئے کہ ان خلافتی رہنماؤں کا بعد از جنگ خلیفہ کے لئے ہمدردانہ رویہ اور تحریک کسی بھی طرح برطانوی حکومت کے لئے خطرات کا باعث نہ تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ یہ تحریک چلا کر برطانوی کی حکومت کے منصوبوں میں اس کے زبردست معاون و مددگار ثابت ہو رہے تھے۔

برطانوی حکومت کی اس تحریک کے لئے کھلم کھلا حمایت کا اندازہ ان کے اس فیصلے سے لگایا جا سکتا ہے جب انھوں نے تحریک خلافت کے لئے مالی مدد فراہم کی تا کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کا دفاع یورپ جا کر کر سکیں۔ ۱۹۲۰ میں خلافتی وفد جس کی سربراہی ڈاکٹر انصاری کر رہے تھے وہ وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ (Chelmsford) سے ملا جس نے اس ملاقات میں وفد میں شامل اراکین کو

حکومت برطانیہ اور اپنی مکمل مدد اور حمایت کا یقین دلایا۔

ہندوستانی خلافتیوں کے برطانوی سرکار کے ساتھ گرم جوشی کے روابط کی ایک "ہلکی سی جھلک(Petty details)" ہمیں "مولانا" شوکت علی کے اس خط سے واضح ہوتی ہے جو کہ انھوں نے ۲۰ جنوری ۱۹۲۰ کو برطانوی حکومت کے ایک افسر Mr.Maffey کو لکھا جس مین انھوں نے یہ درخواست کی کہ ہندوستانی حکومت ان کے اور تحریک خلافت کے دیگر پانچ اراکین کے یورپ کے فضائی سفر کے لئے فرسٹ کلاس کے ٹکٹوں کا بندوبست کریں تاکہ یہ لوگ یورپ جاکر برطانوی عوام اور پارلیمنٹ اور پیرس کی امن کانفرنس میں خلافت کی بحالی کے لئے اپنے نقطۂ نظر کو وہاں پیش کر سکیں۔ شوکت علی کی اس درخواست کا ایک سرسری جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے لئے چلائی جانے والی تحریک کے نام نہاد چیمپئن کس طرح اپنے نوآبادیاتی مالکوں کے آگے بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ حکومت ہند کے محکمۂ داخلہ کے سیکریٹری نے شوکت علی کی اس درخواست پر فوری کاروائی کرتے ہوئے حکومت بمبئی سے فوری رابطہ کر کے بمبئی کی حکومت کو یہ ہدایت کی کہ خلافت تحریک کے لیڈروں کے اس دورے کی سیاسی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ان کے سفر کے لئے بہترین انتظامات کریں۔ اس واقعہ سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ برطانوی حکومت خلافت تحریک کو بالکل بھی اپنے لئے خطرے کا باعث نہیں سمجھتی تھی کیونکہ یہ برطانوی مفادات کو ٹھیس نہیں پہنچا رہی تھی۔ برطانیہ کے لئے یہ تحریک اس وقت پریشانی کا باعث بنی جب کانگریس کے چند لوگوں نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا ارادہ کیا اور چند انفرادی لوگوں نے مسلمانوں سے یہ التجا اور اپیلیں کرنا شروع کردیں کہ وہ برطانوی فوج کی نوکری نہ کریں۔ ایسے بیانات برطانوی مفادات کو نقصان پہنچانے کے مترادف تھے۔ لیکن سول نافرمانی کی تحریک کے لئے یہ اپیلیں صرف کانگریس کے حلقوں کی طرف سے کی جارہی تھیں اور خلافتی لیڈروں نے ان کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔

عام طور پر تحریک خلافت کو ایک ایسی تحریک تصور کیا جاتا ہے جو کہ اپنے ظہور میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف اٹھی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کی سب سے اہم " کامیابی" یہ ہے کہ اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو سیکولر سیاست سے الگ کر کے انھیں مذہبی اور کمیونل سیاست کے قریب کردیا۔ اس تحریک نے مسلمان علماء (clergy) کی سیاسی بھرتی (Activism) کی

ایک ایسی روایت چھوڑی جو کہ ہندوستان اور پاکستان کی سیاست کو آج بھی ایک مسئلہ (Bedevils) تصور کرتی ہے۔اس تحریک کا سب سے آخری تضادی پہلو(Final Irony) یہ تھا کہ گاندھی جو کہ ہندوستان کی " سیکولر " ہندوستانی قوم پرستی کے علم بردار تھے وہ اس دور افتادہ (Atavistic) تحریک کے ڈکیٹر(Dictator) ثابت ہوئے جس نے بالآخر ترکی کے قوم پرستوں کو بھی دغا دیا اور عرب قوم پرستوں کے ساتھ بھی بے وفائی کی۔گاندھی ایک جہاں دیدہ اور عقل مند سیاسی لیڈر تھا جو کہ ترکی اور عرب کے علاقوں میں اٹھنے والے تحریکوں کے اصل سیاسی حالات سے انجان نہ تھا۔اس کا اس مسئلے میں ادا کئے جانا والا کردار بہت سارے سوالات کو جنم دیتا ہے جن کے جوابات دیئے جانے انتہائی ضروری ہیں۔بد قسمتی سے اس تحریک کی نوعیت اور گاندھی کی قیادت کی وجہ سے بہت سارے ہندوستانی قوم پرست محققوں نے اس تحریک اور اس میں گاندھی کے کردار کو تنقید کی نظر سے دیکھا ہی نہیں۔جبکہ دوسری طرف محمد علی جناح (جسے اس مصنف نے کئی مرتبہ غلطی سے مذہبی رہنما(Communalist Leader) ہونے کا موردِ الزام ٹھہرایا ہے وہ اس معاملے میں سیکولر نقطۂ نظر رکھنے والے شخص ثابت ہوئے) کو " مولانا " شوکت علی نے اس(Activists) مذہبی تحریک کی مخالفت کرنے پر عملی حملہ(Physically Beaten) کیا۔ جس کے اثرات ہندوستانی (اور پاکستانی) مسلمان سیاست پر انتہائی منفی اثرات پڑے۔خلافت تحریک نے مسلمانوں بنیاد پرستوں (clergy) کی سیاسی قیادت کی بنیاد رکھی جسے بعدازاں مسلمان نظریہ سازوں نے باآسانی اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کردیا۔

حوالہ جات

(۱) گیل منہلٹ (Minault Gail) کی ۱۹۸۲ میں خلافت تحریک پر شایع ہونے والی تحقیق اس موضوع پر ہونے والی اب تک کی سب سے بہترین تحقیق ہے۔ لیکن اس کی تحقیق میں عمومی طور پر ان باتوں پر یقین کرلیا گیا جن پر اس تحریر میں سوالات اٹھائے گئے ہیں۔

(۲) Arnold،۱۹۲۴، صفحہ ۹۴۔

(۳) Hitti،P.K، صفحہ ۶۷۲۔

(۴) Hitti، صفحہ ۶۷۶-۶۷۷۔

(۵) Lewis, Bernard،۱۹۶۱،۱۲۱ صفحہ

(۶) غزالی ۱۹۶۴ صفحہ ۴ اور الماوردی ۱۹۶۰، باب اوّل، حصہ اوّل

(۷) ہندوستان کے ان علماء جنہوں نے اس اس فتوے کے حق میں دستخط کئے اور جنہوں نے اس پر دستخط سے انکار کیا اس کی فہرست Minault کی کتاب (1982) کے صفحہ ۸۰ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

(۸) اس مسئلے پر مختصر اًمطالعے کے لئے دیکھیے علوی Alavi ۱۹۸۸ صفحہ ۸۴

(۹) سنیال (Sanyal) کی ۱۹۹۴ میں آنے والی تحریر بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ بریلوی روایات کی ایک بڑی طویل تاریخ ہے۔ اس کی ابتداء احمد رضاء خان نے نہیں کی تھی لیکن اس صدی کے وہ ایک اہم بریلوی سربراہ تھے۔

(۱۰) مولانا آزاد کے یہ جملے قاضی محمد عدیل عباسی (Abbasi،۱۹۸۲) سے لئے گئے ہیں۔ یہ الفاظ آزاد نے بنگال کی صوبائی خلافت سانوس کے اجلاس مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۲۵ کو خطاب کرتے ہوئے کئے۔ عباسی نے یہ الفاظ زمیندار کے اخبار کے ریکارڈ سے نکال لئے ہیں جو کہ تحریک خلافت کے پروپیگنڈہ کا سب سے اہم اور مؤثر ذریعہ تھا اور عباسی اس اخبار کا ڈپٹی ایڈیٹر تھا۔ اس

کے ساتھ ساتھ عباسی آزاد کا ایک قریبی رفیق اور دوست بھی تھا اور تحریک خلافت کا ایک نہایت ہی معتبر نام بھی تھا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آزاد کے یہ الفاظ شورش کاشمیری کی ادارت میں شائع ہونے والی کتاب "خطبات آزاد" (Azad،۱۹۴۴) میں حذف کر دیئے گئے۔ اس کے مقابلے میں عباسی آزاد کے زیادہ قریب تھے اور ان کے الفاظ زیادہ قابل بھروسہ ہیں۔ آزاد کے ان اہم خیالات اور الفاظ کے بعد ازاں ملک رام Malik Ram کی ادارت میں شائع ہونے والے "خطبات آزاد" (Azad،۱۹۷۴) میں بھی نظرانداز کر دیا ہے۔

(۱۱) خلیفہ اور امام کے الجھے ہوئے القابات میں سے آزاد نے اس بگڑی ہوئی نظریاتی روایت کو قبول کیا ہے جو کہ عباسی دور کے آخری ایام میں رواج پذیر ہوئی اور جہاں خلیفہ کے رتبے کو امام کی غیر ضروری مذہبی خصوصیات کے ساتھ ایک مذہبی کردار دے دیا گیا۔

(۱۲) یہ شرط ہندوستان کے معاملے میں لاگو نہیں ہوتی کیونکہ عثمانی سلطان اس علاقے کے حکمران نہ تھے۔

(۱۳) مودودی Maududi، ۱۹۶۱، صفحہ ۳۸

(۱۴) سر سیّد احمد خان لکھتے ہیں "اپنے تئیں خلیفہ کے لفظ سے اپنے آپ کو تعبیر کیا"۔

(۱۵) سر سیّد احمد خان ۱۹۶۲، صفحہ ۱۲۲۔۱۲۵

(۱۶) خلفاء لفظ خلیفہ کی جمع ہے۔

(۱۷) الماوردی Al-Mawardi، ۱۹۶۰، صفحہ ۷۰۔۶۹

(۱۸) Goldziher، ۱۹۷۱، صفحہ ۶۸۔۶۷

(۱۹) آزاد Azad، خطبات آزاد، لاہور، ۱۹۴۴، صفحہ ۱۹۲

(۲۰) سیّد احمد خان Syed Ahmed Khan, ۱۹۶۲، صفحہ ۱۶۵

(۲۱) شعبان Shaban، ۱۹۸۰، ۱۹

(۲۲) ہٹی Hitti، ۱۹۶۰، صفحہ ۴۶۵، مزید دیکھئے آرنلڈ Arnold ۱۹۲۴ صفحہ ۵۷

(۲۳) گولڈزر (Goldziher) ۱۹۷۱، صفحہ ۶۸۔۶۷، لفظ خلیفۃ اللہ درج ذیل زیر بحث آیا

(۲۴) بوسورتھ Bosworth، ۱۹۶۷

(۲۵) اسٹوجانوک Stojanovic، ۱۹۳۹، صفحہ ۲

(۲۶) گیوہر Gewhr، ۱۹۶۷، ۲۸

(۲۷) انالیک Inaleik، ۱۹۷۳، صفحہ ۱۲۳

(۲۸) علوی Alavi، ۱۹۸۸، صفحہ ۶۸

(۲۹) اس سلسلے میں مزید مفید عبدالسلام خورشید کا ایک چھوٹا سا کتابچہ بڑا اہم بمقابل امداد صابری کی تین جلدوں پر مشتمل ضخیم کتب (Sabri، ۱۹۵۳)

(۳۰) مینالٹ (Minault) ۱۹۸۲ صفحہ ۵۱

(۳۱) فیروز احمد جدید ترکی کے ایک نامور تاریخ دان تھے اور انہیں پاکستان کے مارکسی اور سندھی قوم پرست اسکالر فیروز احمد نہ سمجھا۔

(۳۲) فیروز احمد ۱۹۹۳، صفحہ ۴۰

(۳۳) آغا خان Agha Khan، ۱۹۵۴، صفحہ ۱۶۳

(۳۴) آغا خان Agha Khan، ۱۹۵۴، صفحہ ۱۶۳

(۳۵) آغا خان Agha Khan، ۱۹۵۴، صفحہ ۱۶۴

(۳۶) لیوس Lewis ۱۹۶۱، ۲۳۳

(۳۷) آغا خان Agha Khan، ۱۹۵۴، صفحہ ۱۶۵

(۳۸) آسکن Aksin, ۱۹۷۶، ۲۲۹، میں اس کے لئے ڈاکٹر ہکی Dr. Hakki Rizatepe کا مشکور ہوں کہ جنھوں نے مجھے اس مضمون کے لئے آسکن سے ترکی زبان سے مضمون کو ترجمہ کر کے دیا۔

(۳۹) محمد علی کی انڈین نیشنل کانگریس کے ۲۶ دسمبر ۱۹۲۳ کے جلسہ میں صدارتی خطبہ پر تقریر۔ محمد علی ۱۹۴۴ صفحہ ۲۹۹ سے لی گئی

(۴۰) آسکن Askin ۱۹۷۶، صفحہ ۹۳

(۴۱) آسکن Askin ۱۹۷۶، صفحہ ۱۶۸

(۴۲) لیوس Lewis، ۱۹۶۱، ۲۳۵

(۴۳) عباسی Abbasi ۱۹۸۶، ۲۱۰ اور لیوس ۱۹۶۱، ۲۴۶

(۴۴) لیوس Lewis، ۱۹۶۱، صفحہ ۲۴۲

(۴۵) اتاترک Ataturk، ۱۹۶۳، صفحہ ۵۔۷۴۰ صفحوں پر مشتمل یہ تقریر اتاترک نے ۶ دنوں میں

اکتوبر ۱۹۲۷ میں ریپبلکن پارٹی کے نمائندوں اور وفود سے خطاب کرتے ہوئے یہ طویل تقریر کی اور حاضرین کی صبر کی داد دی انہوں نے بیٹھ کر یہ تقریر سنی۔

(۴۶) اتاترک Ataturk ۱۹۶۳ صفحہ ۸، مصطفیٰ کمال کی اس طویل تقریر میں خلیفہ کے کردار پر شدید غصہ کا اظہار کیا گیا۔

(۴۷) اس ٦ روزہ تقریر کی اہم بات یہ تھی کہ مصطفیٰ کمال کے خلیفہ کے مذہبی اور سیکولر کردار کے بارے میں بڑی وضاحت سے بات کی اور بادشاہ کا لفظ سلطان کے سیکولر اور خودمختار حکمران ہونے کے معنوں میں استعمال کیا گیا۔

(۴۸) اتاترک Ataturk ۱۹۶۳، صفحہ ۷

(۴۹) اتاترک Ataturk ۱۹۶۳، صفحہ ۱۰

(۵۰) اتاترک، ۱۹۶۳، صفحہ ۱۱

(۵۱) فیروز احمد Feroz Ahmed، ۱۹۹۳، صفحہ ۴۸

(۵۲) عباسی Abbasi ۱۹۸۶، صفحہ ۱۹۹

(۵۳) عباسی Abbasi، ۱۹۸۶، صفحہ ۲۰۸

(۵۴) ہوم پول Home Poll، ۵۸۸، ۱۹۲۰، صفحہ ۲۔۱۴

Abbasi, Qazi Mohammad Adeel, 1986, Tehrik-e-Khilafat, Lahore.

Agha Khan, The, 1954, The Memoirs of Aga Khan, New York

Ahmad, Aziz, 1964, Studies in Islamic Culture in the Indian Environment, Oxford.

Ahmad, Aziz, 1967, Islamic Modernism in India and Pakistan, London.

Ahmad, Feroz, 1969, The Young Turks: The Committee of Union and Progress in Turkish Politics 1908-1914, Oxford.

Ahmad, Feroz, 1984, 'The Late Ottoman Empire', in Marian

Kent (ed) The Great Powers and the end of the Ottoman Empire, London.

Ahmad, Feroz, 1993, The Making of Modern Turkey, London.

Alavi, Hamza, 1988, 'Pakistan and Islam: Ethnicity and Ideology' in Fred Halliday (ed), State and Ideology in the Middle East and Pakistan, London and New York.

Aksin, Sina, 1976, Istanbul Hukumetleri va M[illegible] [illegible]le, Istanbul.

Ansari, Sarah, F.D., 1992, Sufi Saints and State Power: The Pirs of Sind, Cambridge.

Arnold, T.W., 1924, The Caliphate, London.

Ataturk, Mustafa Kemal, 1963, A Speech Delivered by Mystafa Kemal Ataturk, 1927, 744pp, Speech delivered before the Deputies of the 'Republican Party' from 15th to 20th October, 1927, Istanbul.

Atiyah, E., 1958, The Arabs, Harmondsworth.

Azad, Abul Kalam, 1944, Khutbaat-e-Azad, edited by Sorish kashmiri, Lahore.

Azad, Abul Kalam, 1974, Khutbaat-e-Azad, edited by Malik Ram, Delhi.

Azad, Abul Kalam, n.d./a, Tazkira, ed. Malik Ram, Islamic Publishing House, Lohore.

Azad, Abul Kalam, n.d./b, Azad ki Kahani Khud Azad ki Zabani, Malihabadi (ed), Lahore.

Bosworth, C.E., 1967, The Ismalic Dynasties, Edinburgh.

Evangelos, K., n.d. Greece and the Eastern Question.

Gewehr, W.M., 1967, The Rise of Nationalism in the Balkans: 1800-1930.

Ghazali, Imam, 1964, Counsel for Kings (Basihat Al-Muluk) with Introduction by F.R.C. Bagley, London.

Gibb, H.A.R., 1962, Studies on the Civilization of Islam, London.

Gokalp, Ziya, 1959, Turkish Nationalsim and Western Civilization, London.

Goldziher, Ignaz, 1971, 'Umayyads and Abbasids' in Muslim Studies, Vol.II, London.

Greenwall, H.J, 1952, His Highness the Aga Kha, London.

Hardy, Peter, 1972, The Muslims of British India, Cambridge.

Hasan, Mushirul (ed), 1985, Communal and Pan-Islamic Trends in Colonial India, New Delhi.

Hasan, Mushirul (ed), 1992, Islam and Indian Nationalism: Reflections om Abul Kalam Azad, New Delhi.

Hitti, P.K., 1960, History of the Arabs, London.

Hourani, A.H., 1945, Great Britain and the Arab World, London.

Husain, Mahmud, 1957a, A History of the Freedom Movement, Karachi.

Husain, Mahmud, 1957b, 'Tipu Sultan' in Mahmud Husain

(ed) 1957a.

Ikram, S.M., 1965, Mauj-e-Kauthar, Lahore (reprint).

Inalcik, Halil, 1973, The Ottoman Empire: The Classical Age 1300-1600, London.

Jackson, Stanley, 1952. The Aga Khan, London.

Khurshied, Abdus Salaam, n.d.Sahafat: Pakistan va Hind main (in Urdu), Lahore.

Lewis, Bernard, 1961, The Emergence of Modern Turkey, London.

Margoliouth, D.S., 1922, 'The sense of the Title Khalifah' in T.W. Arnold and R.A. Nicholson (eds) A Volume of Oriental Studies Presented to Edward G. Browne, Cambridge

Maududi, Abul A'la, 1961, Tajdid va Ahyay-e-Din, Lahore (reprint).

Maududi, Abul A'la, 1982, Khilafat va Mulukiyat, Lahore (reprint).

Al-Mawardi, Abul-Hassan, 1960, Al-Ahkam as-Sultaniya, Cairo.

Minault, Gail, 1982, The Khilafat Movement: Religious Symbolism and Political Mobilisation in India, Delhi.

Minault, Gail, 1992, 'The Elusive Maulana: reflections on Writing Azad's Biography' in Hassan (ed) 1992.

Mohammad Ali, 1944, Speeches and Writings of Maulana Mohammad Ali, Lahore.

Nuseibeh, H. Zaki, 1959, The Ideas of Arabs Nationalism, Ithaca.

Owen, S.J. (ed), 1877, Selections from Wellesley's Despatches, Oxford.

Sabri, Imdad, 1953, Tarikh-e-Sahafat-e-Urdu, Delhi, 3 volumes.

Sanyal Usha, 1996, Devotional Politics in British India: Ahmad Riza Khan Barelwi and his Movement, 1870-1920, New Delhi (Forthcoming).

Shaban, M.A., 1980, Islamic History, Vol.I, Cambridge (reprint).

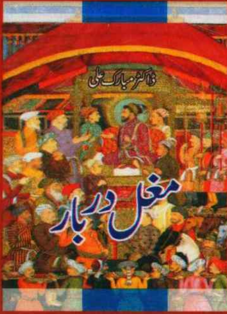
Shaban.M.A., 1981, Islamic History, Vol II, Cambridge (reprint).

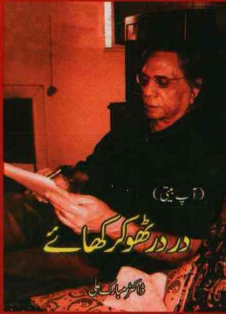
Shukla, R.L., 1973, Britain, India and the Turkish Empire, 1853-1882, New delhi.

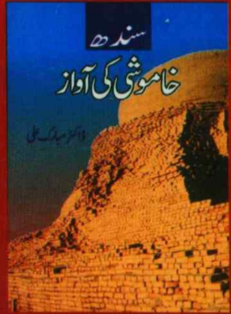
Stojanovic.M.D., 1939, The Great Powers and the Balkans: 1875-1878, Cambridge.

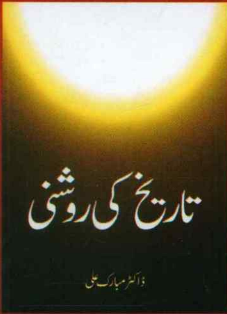
Sunar, Ilkay, 1974, State and Society in the Politics of Turkey's Development, Ankara.

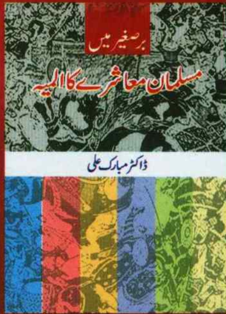
Syed Ahmad Khan, 1962, Maqalat-e-Sir Syed, Vol I, Lahore articles on 'Khilafat', 'Khilafat aur Khalifa' and 'Imam aur Imamat'.

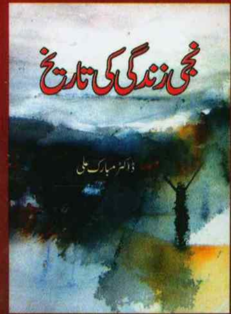


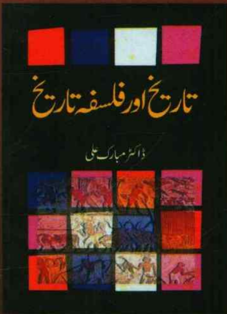


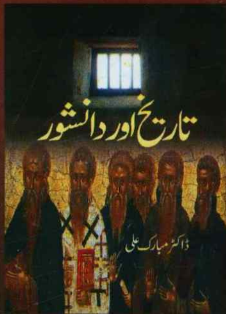


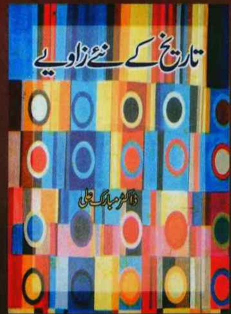












تاریخ پبلیکیشنز



تقسیم کار



فکشن ہاؤس
لاہور ● حیدر آباد ● کراچی ●
e-mail:fictionhouse2004@hotmail.com